موت کا شہر

اکرم الہ آبادی

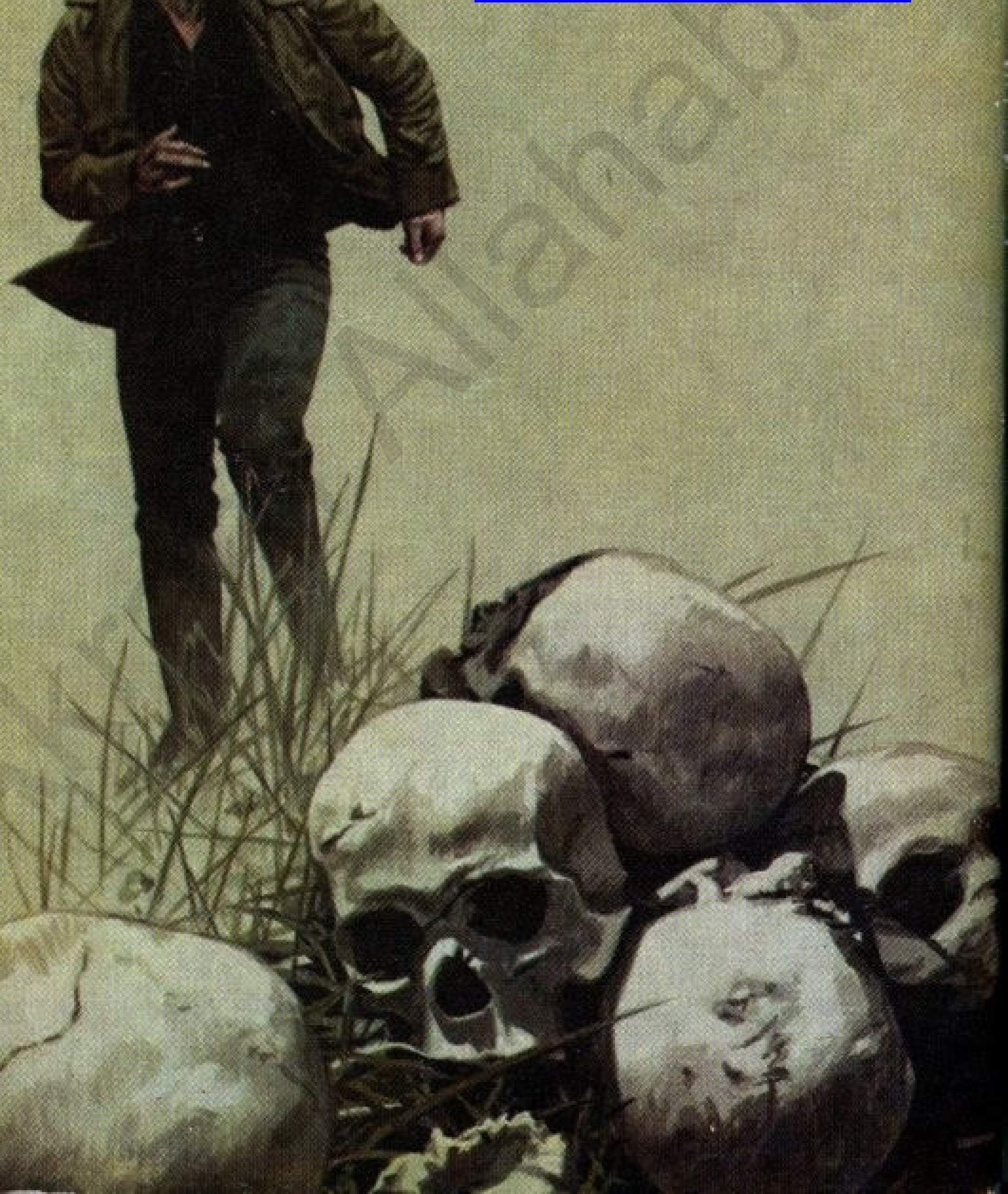

جاسوسی دائرہ سیریز

ایک نفسیاتی ناول

موت کا شہر

اکرم الہ آبادی

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں ۔اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے ۔جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی ۔

پرنٹر :۔۔۔۔ممبئی ۔انڈیا

Akram Allahabadi

انتساب

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام جو ایشیا کی ایک عظیم شخصیت ہیں۔ عظیم اس لیے نہیں کہ کانگریس کے صدر ہیں، نہ اس لیے کہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم ہیں۔ وہ آسام کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لیے سب سے پہلے پہنچے تھے اور ان کی اپیل پر ہندوستان کا نوجوان خون آسام کی خشک رگوں تک پہنچ گیا تھا۔

اکرم

Akram Allahabadi

تعارف

"موت کا شہر" ایک عجیب وغریب داستان ہے جس کی آغوش میں ان لاتعداد آسامیوں کی بے گناہ و بے قصور جانیں موت کی گہری نیند سو رہی ہیں جو ایک غیر متوقع قیامت کے اچانک شکار ہو گئے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں کوئٹہ کے زلزلے کے بعد اور شاید دنیا کی تاریخ میں روم کے شہر پمپی آئی کے قیامت خیز زلزلے کے بعد دوسرا سب سے خوفناک زلزلہ آسام میں ۱۹۵۰ء میں آیا۔ جب شمال مغربی آسام کی زندگی یکایک موت کے مرتعش ہاتھوں میں سکڑ گئی۔ اور جب انسان انسان کی مدد کو دوڑے، بھوکی زمین جگہ جگہ سے دہانے کھول کر چلتے پھرتے جانداروں اور صحیح وسالم عمارتوں کو نگل گئی۔

زلزلے کے مسلسل اور شدید جھٹکوں نے سیسہ پلائی ہوئی دیواروں والے ایوانوں کو بھی ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا۔ سر اٹھائے کھڑے ہوئے تن آور درخت پیوندِ خاک ہو گئے۔ ٹیلے زمین میں دھنس گئے اور آبادیاں ویرانوں میں بدل گئیں۔

نہ جانے یہ قہرِ الٰہی تھا یا محض ایک اتفاق۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا یہ ایک سنسنی خیز المیہ تھا جس کے نقش و نگار آج بھی شمالی مغربی آسام اور ڈبرو گڑھ ڈسٹرکٹ کے دامنِ کوہ کے ان قصبوں میں اس ہیبت ناک شکل میں نظر آتے ہیں جسے دیکھ کر دیکھنے والے کا دل لرز اٹھے اور انسان اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکے کہ وہ کچھ نہیں... وہ خود کچھ نہیں... وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک حقیر ترین مخلوق جس کی زندگی حوادث کے رحم و کرم پر کروٹیں بدلتی ہے، جیتی اور مرتی ہے۔

لیکن ذہن آج بھی سوچ رہا ہے کہ یہ زلزلہ پنجاب میں کیوں نہیں آیا... یہ زلزلہ بنگال میں کیوں نہیں آیا... یہ زلزلہ کوریا، ملایا، تیونس، ایران، ویٹ نام اور جنوبی افریقہ میں کیوں

Akram Allahabadi

نہیں آیا... یہ زلزلہ آسام میں کیوں آیا۔ یہاں لوگ کم مہذب ضرورت تھے، مگر درندے نہ تھے۔

کاش کوئی نظام ہوتا جو صرف انسانیت کے قاتلوں کو ہی سزائیں دیتا۔

بہر حال، ہماری کہانی بھی ڈیرہ وگڑھ ڈسٹرکٹ کے ایک ایسے قصبے سے شروع ہوتی ہے جسے اس خوفناک زلزلے نے خس وخاشاک کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کوئی زندہ نہیں بچ سکا۔ کوئی عمارت، کوئی حصہ صحیح سالم نہ رہ سکا۔ زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہے۔ یہاں تک کہ اس قصبے کی طرف جانے والی سڑکیں اور راستے بھی زلزلے کے شدید جھٹکوں سے جگہ جگہ سے اس طرح پھٹ گئے کہ وہ باقی ڈیرہ وگڑھ سے کٹ کر علیحدہ ایک شہر خموشاں رہ گیا۔

اور اس قصبے کے بارے میں ڈیرہ وگڑھ والوں میں طرح طرح کی روایات مشہور تھیں۔ عام طور پر لوگ اسے موت کا شہر کہتے تھے، کیونکہ اس وسیع آبادی کے لمبے چوڑے کھنڈرات کے خطے پر موت کی بھیانک اور اداسی اس طرح مسلط ہو کر رہ گئی تھی کہ دور سے اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے والے کی روح بھی تاثر سے کانپ جائے۔ لوگ اسے موت ک شہر کہتے تھے، کیونکہ یہاں موت ہی موت ہر طرف رقصاں نظر آتی۔ آگے موت، پیچھے موت، دائیں موت، بائیں موت اور اوپر نیچے موت ہی موت کے افسردہ نقوش اپنی بھیانک خموشی سے ماحول پر ایک لرزا دینے والی سنسنی طاری کیے ہوئے تھے۔

اور اس موت کے شہر سے ایک کہانی شروع ہو کر ناول کے ان صفحات پر پھیلتی چلی گئی ہے، جسے شروع کرنے کے بعد کوئی جب تک ختم نہ کر لے، شاید خود سکون سے نہ بیٹھ سکے گا۔ اس تسلسل میں جو آسیبیت ہے وہ پڑھنے والے کو خوف زدہ کرنے سے زیادہ اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ خود اس سے فرار پسند نہیں کرتا۔

میں نے یہ نئی کہانی جو تمام تر میری اپنی اپج ہے، ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ (Dr

Akram Allahabadi

(Sigmund Freud) کے فلسفۂ تحلیلِ نفسی (Psycho-Analysis) کی بنیاد پر لکھی ہے۔ڈاکٹر فرائیڈ اپنے دور کا ماہرِ نفسیات مانا گیا ہے۔(حالانکہ علمِ نفسیات کا پہلا نباض ڈاکٹر پیئر جوزف تھا) اور نفسیات کے فلسفے (Psychology) سے پھیل کر فلسفۂ تحلیلِ نفسی پر اس نے انسان کے فکر و یقین کو ایک ایسا آئینہ پیش کر دیا ہے، جس میں ہر آدمی اپنی صورت اپنے فطری رنگ میں دیکھ سکتا ہے۔جس میں آدمی کو اپنے خیالات تک منعکس نظر آجاتے ہیں۔

بہر حال، میں اگر اس فلسفہ پر یہاں بحث کروں تو اس سے ناول کی دلچسپی کم ہو جائے گی۔بہتر یہی ہوگا کہ آپ خود اسے پڑھنے کے بعد سب کچھ سمجھ سکیں۔البتہ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس ناول میں، اس کے پلاٹ میں یا اس کی جزویت میں فرائیڈ کا بھی کچھ حصہ ہے۔یہ میری اپنی تصنیف ہے اور طبعزاد۔یہ ایک انتہائی جذباتی رومان کی داستان ہے۔ایک عجیب و غریب محبت جو خوفناک ہے اور پھر بھی پیاری، جو آسیب زدہ ہے اور پھر بھی زندگی سے زیادہ عزیز۔جس کی تکمیل اگر ممکن نہیں تو اس سے فرار بھی ناممکن ہے۔

ہاں اتنا ملحوظ رہے کہ اس ناول کے کردار اور بعض مقامات کے نام فرضی ہیں جو اس کی دلچسپی کے لیے اپنائے گئے ہیں۔اور اب آگے آپ دیکھیے، میں درمیان سے ہٹا جاتا ہوں، لیکن اتنا اور کہہ کر کہ اسے پڑھنے کے بعد آپ نے اگر اپنے خیالات وآراء سے مجھے آگاہ کیا تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔

فقط

آپ کا اکرم

۲۱صغریٰ منزل

ریپن روڈ، بمبئی ۸

Akram Allahabadi

موت کا شہر

آسمان کا رنگ دوپہر کی دھوپ کی طرح زرد ہو رہا تھا اور پگھلا ہوا سونا زمین کے ابھار پر حدِ نظر پھیل گیا تھا۔ ہمالہ کے دامن میں فضاؤں پر ایک گہرا سکوت مسلط تھا، اتنا گہرا جیسے ترائی کی آبادی موت کی نیند سو گئی ہو۔ اور اس زرد آسمان پر بہت سی چیلیں، گدھ اور کوے اس طرح منڈلا رہے تھے جیسے انھیں یہیں کہیں، آس پاس کوئی دعوت ملی ہے۔

اڑتے ہوئے پرندوں میں سے ایک بوڑھی چیل نے نیچے دیکھ کر غوطہ مارا اور اپنے چوڑے پر سمیٹتی ہوئی زمین پر اتر آئی۔ وہ ان مردار خور گدھوں کے بے ترتیب غول میں شامل ہو گئی جو ایک مردہ ڈھور کی سڑتی ہوئی لاش کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ یہ فضا اور اس کے آس پاس کا ماحول بھی اسی منظر کی طرح بھیانک اور خاموش تھا۔ ان کے نزدیک اور ان سے دور بہت دور تک اس موت کے شہر کے کھنڈر پھیلتے چلے گئے تھے۔ کھنڈر ہی کھنڈر۔ شکستہ عمارتوں کے، ویران جھونپڑوں کے، سر بفلک محلوں کے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پورا شہر مسمار ہو کر صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ دور حدِ نگاہ تک سوائے موت کی سی سنسنی اور ویرانی کے بھیانک سکوت کے، کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ کسی جانور کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ اچانک ایک دن تلسی کھیڑہ کی تمام آبادی چند گھنٹوں میں ہی شہرِ خموشاں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ زمین جگہ جگہ سے اس طرح درک گئی تھی جس طرح قحط سے سوکھے کھیت پھٹ جاتے ہیں۔ چٹانیں زمین میں دھنس گئی تھیں، جیسے بھوکی دھرتی طیش میں آ کر پتھر چبانے لگی ہو۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا نقشہ بگڑ گیا تھا اور کبھی آباد رہنے والے اس قصبے کی سڑکوں میں اتنے بڑے بڑے اور گہرے شگاف پڑ گئے تھے کہ اندر گر جانے والے آدمی یا شے کا نشان تک نہ ملے۔ اور ان ہی شگافوں میں شہر کی ان سڑکوں پر چلنے والے کتنے ہی جیتے جاگتے لوگ، کتنے ہی بوڑھے، کتنے ہی جوان،

Akram Allahabadi

کتنے ہی بچے اور کتنی ہی عورتیں اچانک اس طرح سما گئی تھیں جیسے مدت سے گرسنہ زمین یکا یک اپنے چوڑے دہانے کھول کر سب کو نگل گئی ہو، یا جیسے وہ انسان کے پاپوں کا بوجھ نہ سنبھال سکی ہو۔ ایک بھی درخت کہیں کھڑا نظر نہ آتا تھا۔ بہت سے زمین میں دھنس گئے تھے اور بہت سی پھٹی ہوئی زمین کے شگافوں میں آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ تلسی کھیڑہ کسی کونے سے بھی سلامت نہ تھا۔ ہر چیز اپنے وجود سے ایک ڈھانچہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اسی بھیانک تبدیلی کا سبب تھا وہ زلزلہ جو کبھی آسام میں آیا تھا۔ اور جس کا سب سے زیادہ اثر ڈیروگڑھ ڈسٹرکٹ پر پڑا تھا۔ ڈیروگڑھ پھر بھی بعض اطراف میں سلامت رہ گیا تھا۔ لوگ جیتے جاگتے بچ گئے تھے، لیکن ڈیروگڑھ کا یہ قصبہ تو اس بری طرح اس غیر معمولی زلزلے کا شکار ہوا تھا کہ ہر طرف بس کھنڈر ہی کھنڈر نظر آ رہے تھے۔

ڈیروگڑھ والے کہتے تھے کہ یہاں کوئی بھی سلامت نہیں بچا۔ ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔ یہاں اچانک ہزاروں موتیں ہوئی تھیں۔ ان انسانوں کی جن میں بے گناہ بھی تھے اور گناہگار بھی۔ معصوم بھی اور بدکار بھی، لیکن قدرت کا قہر شاید آٹے کے ساتھ گھن کو بھی پیس ڈالنے میں کوئی ناانصافی محسوس نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے اس قصبے کو مکمل تباہی کا شکار ہونا پڑا اور شاید اسی لیے ڈیروگڑھ والے اسے موت کا شہر کہنے لگے تھے۔

وہ اس برباد شدہ آبادی کی سرحدوں کے نزدیک جاتے ہوئے بھی خوف کھاتے تھے۔ ہزاروں موتوں کا شہر، ہزاروں بے گور و کفن لاشیں، ہزاروں روحیں، اس موت کے شہر کا پرہول تصور ان کے ذہنوں پر بری طرح مسلط تھا۔

لوگوں میں تو عام طور پر یہاں تک مشہور تھا کہ اکثر تلسی کھیڑہ کے کھنڈروں کی ٹوٹی دیواروں پر شکستہ مکانوں کی نیم شکستہ چھتوں پر اور زمین میں دھنسی ہوئی چٹانوں پر مرنے والوں کی آوارہ روحیں بھٹکتی دیکھی جاتی ہیں۔

اور اس موت کے شہر کے اس آسیبی تذکرے کے ساتھ ہی لوگوں کے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے۔ کس میں جرأت تھی جو اس کے قریب جائے۔

مگر تا حدِ نظر پھیلے ہوئے اس روح فرسا ویرانے میں ایک ٹیلے پر زمین پر گرے ہوئے برگد کے ایک بوڑھے درخت سے ٹیک لگا کر وہ زمین میں آدھی دھنسی ہوئی ایک چٹان پر بیٹھا تھا، اکیلا، اداس۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا۔ جس کی ایک ٹک سامنے کی طرف گھورتی ہوئی نظریں کسی سوچ کا پتا دے رہی تھیں۔ کوئی گہری سوچ۔ مثلاً کہ موت کیوں آتی ہے؟ اور آتی ہے تو اچانک اتنی بہت سے اکٹھی موتیں کیوں؟ کیا انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا؟ اس کے زندہ رہنے کے حق کا کوئی احترام نہیں؟ ایسا ظلم کیوں؟ اور وہ صرف سوچ ہی رہا تھا۔

اس کا نام روپ تھا۔ وہ کلکتہ سے آیا تھا۔ دوسرے رضا کاروں کی اس پارٹی کے ساتھ جو آسام کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لیے پنڈت نہرو کی اپیل پر کلکتہ یونیورسٹی سے آسام آئی تھی اور جسے آسام ریلیف کمیٹی نے ڈبروگڑھ ڈسٹرکٹ کے ایک امدادی کیمپ میں پوسٹ کردیا تھا۔

وہ کلکتہ یونیورسٹی میں نفسیات کا ایم۔اے۔ کا طالب علم تھا اور اس کے پتا پنڈت پرکاش چندر کلکتہ کے معزز لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ جوٹ کے بہت سے کارخانوں کے مالک تھے اور صرف دو اولادیں ان کی تھیں، ایک روپ دوسرا کشور۔ کشور روپ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس والنٹیئروں کی پارٹی میں آئے ہوئے دوسرے سات لڑکوں میں ایک چٹرجی بھی تھا، جس کا پورا نام تو ہیم چٹرجی تھا، لیکن نام ذرا بولنے میں ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھی اسے ہیم کی بجائے صرف چٹرجی ہی کہا کرتے تھے۔ چٹرجی اس سال وکالت کا امتحان دینے کے لیے چوبیس پرگنہ سے کلکتہ آیا تھا اور روپ کے گھر ہی ٹھہرا تھا۔ کیونکہ پورے بنگال میں روپ سے بہتر اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بھائیوں سے زیادہ خلوص اور محبت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن یونیورسٹی کلب میں ریڈیو پر پنڈت جواہر لال نہرو کی اپیل سن کر سب سے پہلے روپ نے ہی آسام کے لیے والنٹیئر بننے کا عزم ظاہر کیا تو

Akram Allahabadi

اسے پہلی تائید چٹرجی کی ملی اور پھر ان دونوں کے دیکھا دیکھی پانچ اور لڑکے تیار ہو گئے۔ ایک بعد میں آشامل ہوا۔

روپ کے پتا نے بھی اس نیک کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی اور بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور چٹرجی کا کوئی سرپرست ہی نہ تھا، سوائے اس کی بوڑھی ماں کے، جو بیٹے کی مرضی کو ہی اپنی خوشی سمجھتی تھی۔ البتہ کلکتہ سے روانگی کے وقت چٹرجی کی آنکھوں میں آنسو ضرور چھلک اٹھے تھے، جن کا سبب کوئی نہ جان سکا، سوائے روپ کے۔ روپ جانتا تھا کہ چٹرجی کی آنکھوں سے یہ آنسو صرف نیلا کے لیے گرے ہیں۔

نیلا اکہرے بدن کی ایک خوب صورت، مگر خاموش سی لڑکی تھی، جسے روپ کی ماں نے بچپن سے ہی پالا تھا۔ نیلا کا باپ کسی زمانے میں روپ کے پتا کے یہاں منشی تھا اور جب وہ اتفاق سے ایک موٹر کے حادثے میں زخمی ہو کر چل بسا تو نیلا کی پرورش خود روپ کی ماں نے کی۔ نیلا اس وقت تین برس کی معصوم بچی تھی اور اب وہ جوان ہو چکی تھی۔

روپ کی ماں اسے بہت پیار کرتی تھیں اور ان کی آرزو تھی کہ نیلا ہی ان کی بہو بنے، لیکن خود روپ کو نیلا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک ایسے خشک فلسفہ کا طالبِ علم تھا کہ اسے اس نفسیاتی الجھن میں عورت کی جنسی کشش سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی پچھلے دنوں کا ایک تلخ واقعہ بھی اس بیزاری کا سبب تھا، جب کالج کی ایک خوبصورت لڑکی اس کی زندگی میں محبت بن کر آئی تھی اور بے وفا بن کر نکل گئی۔ وہ اس کی ایک ہم جماعت تھی، جس نے بعد میں ایک پروفیسر سے عشق کر لیا تھا۔

نیلا کے بارے میں تو اس کے خیالات ویسے بھی مختلف تھے۔ کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر کے مصداق اس نے کبھی اس کے لیے سوچا بھی نہ تھا۔ خود نیلا کو روپ سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن وہ ماں جی کے احسانوں کو کسی قیمت پر فراموش نہ کر سکتی تھی اور کیونکہ اسے روپ سے بیاہنے کی خواہش ماں جی ہی کو تھی، اس لیے وہ اسی کو اپنا ہونے والا جیون ساتھی سمجھ کر اسے خوش

رکھنے کی کوشش کرتی۔

مگر جب چٹر جی چوبیس پرگنہ سے ان کے یہاں مہمان آیا، نیلا کی خوش زندگی میں ایک خفیف سی ہلچل پیدا ہونے لگی تھی۔جذبات کا جمود پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔محض یہ جان کر کہ چٹر جی کی سنجیدہ نظریں کبھی کبھی اس کے لیے کچھ کہتی ہیں۔ایک خاموش اور انوکھی بات۔شاید محبت۔مگر یہ لفظ تو ان میں سے کسی کی زبان پر نہ آیا تھا، پھر بھی چٹر جی نیلا کی سادگی، اس کی خوبصورتی اور اس کے کردار سے بہت متاثر تھا۔

یہی تاثر بعد میں دل میں جڑ پکڑتے ہوئے محبت کے لطیف جذبات میں تبدیل ہو گیا۔اور شاید ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نیلا سے سب کچھ کہہ ڈالتا۔حالانکہ نیلا ماں جی کی خاطر یقیناً اس کا دل توڑ دیتی، مگر اتفاق سے اسی دن دوپہر کے کھانے پر جب ماں جی نے باتوں ہی باتوں میں اس سے روپ اور نیلا کے ہونے والے رشتے کے بارے میں ذکر کیا تو چٹر جی کی آرزوؤں کا دم گھٹ گیا۔روپ نے خود تو اس سے کچھ بھی نہ بتایا تھا، ورنہ شاید وہ اتنا مہنگا سودا نہ کرتا اپنی زندگی کا۔دل کے شدتِ درد سے کراہ اٹھنے کے باوجود وہ محض اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو جائے، اپنی پلکیں بھی تر نہ کر سکا۔اس کا دل رونے کو چاہتا تھا، مگر وہ مسکرانے پر مجبور تھا۔اس کی محبت چیخ اٹھنا چاہتی تھی، مگر منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ...،

"ماں جی، ایشور مبارک کرے یہ جوڑی۔"

ماں جی اس کے اس خلوص پر مسکرا کر بولیں۔"خوشی تمہیں نہ ہو گی تو اور کسے ہو گی پھر۔"

لیکن یہ تو اس کا ہی دل جانتا تھا کہ اسے کتنی خوشی ہو رہی ہے جو آنسو نکلے پڑ رہی ہیں۔اور اس دن کے بعد وہ اپنے دل پر اپنے آپ پر ایک ناقابلِ برداشت جبر کرنے لگا، نیلا کو بھول جانے کا۔اپنے دل اور اس کی تمناؤں کو کچل دینے کا۔روپ کی خاطر وہ ہر قربانی دے سکتا تھا۔اور کتنا برا ہوا ہوتا اگر بات اس کے منہ سے نکل چکی ہوتی۔دوستی اپنا سر شرم سے نہ جھکا

Akram Allahabadi

لیتی کہ دوست ہی کی منگیتر سے محبت ۔ اسے اپنے آپ پر غصہ سا آنے لگا اور یہی غصہ جب شدید غم میں تبدیل ہو گیا تو وہ ایک دن تنہائی میں بیٹھے بیٹھے رو دیا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ راز راز ہی رہے گا، مگر اس راز کو روپ سمجھ چکا تھا ۔ بلکہ اس نے خود کئی بار رباتوں باتوں میں چھڑ جی کو ابھارنا بھی چاہا، مگر چھڑ جی اب بہت محتاط ہو چکا تھا ۔ روپ نے کئی بار اشارتاً یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسے نیلا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن چھڑ جی تو خود ماں کے منہ سے سن چکا تھا ۔ وہ اس گھر میں چنگاری بن کر گرنا نہ چاہتا تھا جو اسے پناہ دے اور جو اس کے دوست کا ہو ۔

روپ نے آسام جانے کے لیے بھی اسی وجہ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس طرح ایک تو وہ ان کے درمیان سے ہٹ جائے گا اور دوسرے یہ ایک قومی خدمت بھی ہوگی ۔ مگر چھڑ جی کی نگاہیں بھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں ۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ روپ میرے لیے قربانی دینا چاہتا ہے ۔ وہ ایک دوست ہوتے ہوئے اسے کیسے قبول کر لیتا ۔ وہ خود ہی اس کے لیے قربانی کیوں نہ دے ۔ اور ماں جی کو تو بس اپنی دھن رہتی تھی جس کے پیچھے پڑ گئیں، اسی کے پیچھے پڑی ہیں ۔ جو کہہ دیا وہ پورا ہو کر ہی رہے ۔ اس رشتے سے روپ کے گول مول انکار پر وہ اور بھی بضد ہو گئیں کہ یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی ۔ روپ ادب کرتا تھا، خاموش رہ گیا ۔ ان کی اس ضدی فطرت کی وجہ سے خود روپ کے پتا جی بھی ان سے روٹھے روٹھے رہا کرتے تھے، مگر ان کی پرواہ کرے جوتی ۔

نیلا کا بڑا لاڈ تھا ۔ گھر میں اکیلی لڑکی تھی ۔ مگر یہی لاڈ نیلا کی زندگی برباد کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ اسے روپ سے بیاہا جا رہا تھا، حالانکہ روپ اس سے ذرا بھی محبت نہ کرتا تھا ۔ وہ چھڑ جی سے بیاہی جا سکتی تھی، حالانکہ چھڑ جی اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا ۔ بڑا کٹھن امتحان تھا اس کے لیے ۔ اور پھر بھی وہ اس قدر خاموش اور پرسکون گزر رہی تھی جیسے کسی طوفان کی ہلکی سی لہر بھی اس کی کشتی سے نہ ٹکرائی ہو ۔ ماں جی کی خوشی کو وہ فیصلہ سمجھ کر قبول کر چکی تھی اور اسی وجہ سے چھڑ جی کے جذبات سے واقف ہونے کے باوجود اس سے بہت دور رہی ۔ اتنی دور، جیسے اجنبی ۔ اور روپ سے اس قدر قریب جیسے واقعی وہ اس سے بہت محبت کرتی ہو ۔

عجیب عورت تھی وہ ۔ عجیب کردار ۔ اتنا ٹھوس، اتنا گہرا کہ کوئی تھاہ نہ پا سکے ۔ شدت احساس کے باوجود اس کے ماتھے پر ایک شکن نہ ابھر سکی، مگر جس دن روپ اور چٹر جی شام کی گاڑی سے آسام کو روانہ ہو رہے تھے اور وہ روپ کو دروازے تک چھوڑنے آئی تھی، اس کی آنکھیں اندھی نہ تھیں جو چٹر جی کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو نہ دیکھتیں ۔ اور جو اس کی گھٹی گھٹی خاموشی سے اس کے جذبات کی غم انگیز کیفیتیں نہ پڑھ سکتیں، اس کا دل پتھر کا نہ تھا جو چٹر جی کے محبت بھرے دل کی شکست کی آواز کو نہ سن سکتا ۔ اس نے سب کچھ سنا، سب کچھ دیکھا، اور پھر بھی برف کی طرح منجمد اور خاموش رہی ۔ البتہ ایک آخری نظر جو وقتِ رخصت روپ پر سے ہو کر چٹر جی پر آ کر رک گئی تھی، پگھلی ہوئی تھی ۔ وہ سب چھپانے کے باوجود کچھ کہہ گئی ۔ جسے شاید چٹر جی سمجھ سکا، مگر سوچنا بے سود تھا ۔ ماں جی کا فیصلہ جو ٹھہرا ۔

ماں جی سمجھیں رخصت کے وقت شاید روپ کے لیے روئی ہے، لیکن نہ جانے وہ کس کے لیے روئی تھی ۔ روپ کے لیے یا چٹر جی کے لیے ۔ اور روپ اس وقت بھی ہنس رہا تھا ۔ اسے نہ کسی کی جدائی کا احساس تھا اور نہ کسی سے دور جانے کا غم ۔ البتہ اسے چٹر جی کی اس بے بسی کا احساس ضرور تھا اور وہ اب طے کر چکا تھا کہ واپس آ کر اس جھگڑے کو ختم کر دے گا ۔

جب وہ آسام پہنچے تو انھیں یہاں فوجی اور غیر فوجی رضا کاروں کی اور بھی بہت سی پارٹیاں ملیں، مگر انھیں ڈبروگڑھ بھیج دیا گیا، جہاں امدادی رضا کاروں کے ایک کیمپ میں وہ ان فوجی رضا کاروں کے نزدیک ہی ٹھہرائے گئے جو انجینیر نگ کے محکمہ سے آسام میں امدادی کاموں کے لیے آئے تھے ۔ وہ سب تعلیم یافتہ اور زندہ دل نوجوان تھے اور پہلی ہی ملاقات میں یہ لوگ ان سے گھل مل گئے ۔

کیمپ کے آس پاس کے دیہاتیوں نے انھیں اس خوفناک زلزلے کی تباہ کاریوں کے تمام واقعات سنائے، لیکن جب انھوں نے اس موت کے شہر کا ذکر کیا، جہاں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا، تو خود ان کے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے ۔ یہ فوجی اور غیر فوجی رضا کار بڑے

Akram Allahabadi

غور سے اس دہشتناک روایت کو سن رہے تھے جو عام طور پر اس قصبے کے بارے میں یہاں مشہور تھی اور یہ حقیقت تھی کہ وہاں کوئی نہ جاتا تھا، کیونکہ وہاں اب امدادی کاموں کا بھی امکان نہ تھا۔ جب سارا قصبہ ہی تباہ ہو گیا، کوئی بچا ہی نہیں، تو امداد کسے دی جاتی۔ اس لیے پہلے امداد کے مستحق ضروری علاقوں کو امداد پہنچائی جا رہی تھی۔

جب کلعہ یونیورسٹی کے طلبا کی اس پارٹی نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہم وہ موت کا شہر ضرور دیکھیں گے تو انجینیر تنگ کے فوجی رضا کار بھی ان کے ہم خیال بن گئے۔ سب نوجوان تھے اور ویسے بھی طلبا کے ذہن میں ایک قسم کی کرید ہوتی ہے ہر پراسرار چیز کا راز جاننے کی، ہر روایتی مقام کو دیکھنے کی۔ ڈیرہ وگڑھ کے دیہاتی حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے۔

ایک بولا۔ "مگر وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ سنتے ہیں مرنے والوں کی روحیں وہاں ہر طرف بھٹکتی رہتی ہیں۔"

"تب تو ہم ضرور جائیں گے۔" روپ نے بضد ہو کر جواب دیا۔ نگران کا تیسرا ساتھی ہنگلی ناتھ ہی ایک مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ منہ بنا کر کہنے لگا۔ "بھائیو، میں اپنی ماں سے دودھ بخشوا کے نہیں آیا ہوں۔ مفت میں میری ہونے والی بیوی بیوہ ہو جائے گی اور یتیم بچے سرکار کو پالنے پڑیں گے۔"

"تو تمہاری ہونے والی سے ہم شادی کر لیں گے اور بچے اناتھ آشرم میں بھیج دیں گے۔" بوس ہنگلی ناتھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"چل چل، بڑا آیا شادی کرنے والا۔ میں مرا تو تو جیتا بچے گا کیا۔ نرک تک سب کی ٹانگیں گھسیٹ کر لے جاؤں گا۔" ہنگلی ناتھ نے پلٹ کر بوس کو جواب دیا۔ اور سب ہنس پڑے۔ پھر یہ طے رہا کہ کل ۱۰ بجے کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر یہاں سے چلا جائے۔ انجینیر تنگ والوں کے پاس اپنا ٹرک ہے۔ وہ کام آئے۔

چنانچہ دوسرے دن ۱۱ بجے کے قریب یہ لوگ اس موت کے شہر کی طرف روانہ

ہو گئے۔ٹرک میں بیٹھنے کی جگہ کی تو کمی نہ تھی، مگر ہنگلی ناتھ کا اسٹریچر مصیبت بن رہا تھا۔ چٹرجی بگڑ گیا۔

"آخر تم یہ اپنا اڑن کھٹولا کیوں ساتھ لیے پھرتے ہو؟" وہ بولا۔

"میری ماں کی نصیحت ہے کہ بیٹا جب سفر کرو اگر پلنگ نہیں تو کم از کم اسٹریچر ضرور ساتھ رکھو تا کہ کہیں مرو تو تجھے میونسپلٹی کی گاڑی میں ڈال کر نہ لے جایا جائے۔" ہنگلی ناتھ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس پر چٹرجی نے بگڑ کر کہا۔"تم بڑے بے ہودہ ہو۔بات تک کرنے کی تمیز نہیں اور بی۔اے۔ کا اسٹوڈنٹ بنے ہیں۔"

"اے مسٹر چٹر پٹر جی، ذرا چونچ سنبھالیے، آں۔ ورنہ میرا غصہ بھی دس دس بیس بیس میل تک مشہور ہے۔" ہنگلی ناتھ نے مسخرے پن سے منہ بنا کر اپنی آستینیں چڑھا لیں اور سب ہنس پڑے۔ٹرک اسی طرح ڈیرہ وگڑھ کی آباد اور غیر آباد سڑکوں پر دوڑتا رہا اور وہ ہنسی مذاق، بحث تمحیص کرتے باتوں ہی باتوں میں سفر کاٹتے گئے۔

اب گاڑی ایسے علاقوں سے گزر رہی تھی جو شدید طور پر زلزلے کے نقصانات کا شکار ہوئے تھے۔سڑکوں کے دونوں سمت گرے ہوئے مکانوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اکا دکا آدمی چل پھر رہے تھے اور عمارتوں کے کھنڈروں میں آوارہ کتے نہ جانے کیا سونگھتے پھر رہے تھے۔پھر ٹرک اس علاقے سے گزر کر ایک بالکل ویران علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سڑک کے دونوں سمت دور تک زلزلے کے جھٹکوں سے درکے ہوئے کھیت تھے اور گرے پڑے درخت۔ایک جگہ ٹرک کو رک جانا پڑا۔ڈرائیور بولا۔

"گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔سڑکیں پھٹی ہوئی ہیں۔"

"تو پیدل چلو۔" ہنگلی ناتھ نے اپنا اسٹریچر کاندھے پر لاد لیا۔ اور اس طرح پھٹی ہوئی سڑکوں، درکی ہوئی زمین کے خطوں، گری ہوئی عمارتوں اور زمین میں دھنسے ہوئے ٹیلوں کو

عبور کرتے ہوئے یہ لوگ بالآخر اس موت کے شہر پہنچ گئے جہاں کا ہولناک سناٹا انھیں متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا اور بالخصوص دوپہر کی اس دھوپ میں تو یہ سناٹا اور دہشت انگیز معلوم ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کی پارٹی تو تھک کر چور ہو گئی تھی، کیونکہ یہ لوگ زیادہ محنت کرنے اور دور تک پیدل چلنے کے عادی نہ تھے، مگر فوجی رضا کاروں کو کوئی تھکن محسوس نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ یونیورسٹی کے طلبہ تو ایک ٹیلے پر، جہاں اتفاق سے ایک تناور درخت ایک معجزے کی طرح صحیح و سالم کھڑا رہ گیا تھا، بیٹھ گئے۔ اور فوجی پارٹی اور آگے جانے کی نیت سے یہ طے کر کے آگے بڑھ گئی کہ واپسی تک تم لوگ ہمارا انتظار کرنا، پھر سب ساتھ چلیں گے۔

اسی تناور درخت کے سائے میں سب بیٹھ گئے، مگر ہنگلی ناتھ تو اپنے ماں باپ کی نرالی اولاد تھا، وہ علیحدہ اپنا اسٹریچر بچھا کر اس پر لیٹ گیا اور آرام کرنے لگا۔

ڈیرہ وگڑھ والوں کے بیان کے مطابق یہاں ویرانی، موت کی سی سنسنی اور بھیانک پن ضرور تھا اور اس شہر خموشاں کو موت کے شہر کا نام دیا جانا بھی ٹھیک تھا، کیونکہ آپ سے آپ ان اجاڑ کھنڈروں کو دیکھ کر ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا، مگر نہ تو کوئی بات خلافِ معمول ہوئی نہ کوئی روح، سایہ یا شکل دکھائی دی۔ اور یہ لوگ تھے بھی نڈر۔ ان میں روپ ہی سب سے زیادہ حساس تھا۔ وہ اس ویران کدہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں کی ایک ایک چیز کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ چشم زدن میں یہ نقشہ کیسے بدل گیا؟ اس آبادی کے انسان کہاں گھس گئے؟ حیوان کدھر سما گئے؟ مگر وہ پانچوں بیٹھ کر آپس میں تاش کھیلنے لگے تو ان کی تو تو میں میں سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور اسے سکون سے کچھ سوچنے کی عادت تھی۔ وہ اس ٹیلے سے اتر کر ٹہلتا ہوا ان کھنڈروں پر متجسس نگاہیں دوڑاتا ہوا دور تک نکل آیا۔

یہ ایک دوسرا ٹیلہ تھا، جہاں اوپر ایک کسی خوبصورت اور بڑے بنگلے کی تباہ شدہ آثار نظر آرہے تھے، دو منزلہ رہا ہوگا۔

Akram Allahabadi

اوپر کی منزل آدھی سے زیادہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ چھت کا بڑا حصہ گر چکا تھا۔ نیچے کمرہ دالان سب برابر ہو گئے تھے اور ان کا ملبہ ادھر برآمدے تک پھیلا ہوا تھا، جہاں دو تین بڑی میانیں بھی آڑی گری ہوئی پڑی تھیں۔ آثار سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خوش حال خاندان اس کبھی کے خوبصورت بنگلے میں سکون کے دن گزار رہا ہوگا اور اچانک موت کے آہنی شکنجوں نے اسے پیس کر رکھ دیا۔ اس بنگلے کے کھنڈر سے کچھ دور زمین میں دھنسی ہوئی ایک آدھی چٹان پر اس برگد کے بوڑھے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جو زلزلے کے جھٹکوں سے جڑ سے اکھڑ کر چٹان کے بازو میں لیٹ گیا تھا۔ وہ دیر سے اس چٹان پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ موت کیوں آتی ہے؟ اور آتی ہے تو اتنی بہت سی اکٹھی موتیں کیوں؟ پھر اسے اس ویران جگہ اکیلے بیٹھے بیٹھے وحشت سی ہونے لگی اور اس کے ذہن میں وہ دھندلے دھندلے نقوش جو سنی ہوئی باتوں کے نفسیاتی تاثر سے پیدا ہوئے تھے ابھرنے لگے۔ وہ ایک ٹک گھور رہا تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے ان کھنڈروں کی طرف کہ اچانک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے فضاؤں میں ایک دل لرزا دینے والی مدہم گونج کے ساتھ ان ویران کھنڈروں سے کچھ انسانی سائے ابھرے۔ زمین میں دھنسی ہوئی چٹانوں پر کچھ انسانی سائے۔ صرف کالے کالے سائے لہرائے اور پھر ٹوٹی ہوئی چھتوں پر گرے ہوئے درختوں پر غرضیکہ ہر طرف کالے کالے بھیانک سائے اسے موت کا خوفناک رقص کرتے دکھائی دینے لگے۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔ لیکن فوراً ہی جب اس نے سر کو جھٹک کر آنکھیں ملتے ہوئے ایک بار غور سے دیکھا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس صرف غیر آباد کھنڈر اور شہر خموشاں کا ماحول۔ اپنی قوت واہمہ کی اس تخلیق پر اسے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ پر ہی ہنسی آ گئی۔ لیکن ان کھنڈروں میں بھٹکتی ہوئی آوارہ روحوں کا جو تذکرہ وہ ڈیرہ وگڑھ والوں سے سن چکا تھا، وہ اسے غیر شعوری طور پر متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اور یہ ویران کھنڈر اس وہم کو اور قوت دے رہے تھے۔ پھر بھی وہ ان بے سر پیر کی باتوں کا قائل نہ ہونا چاہتا تھا۔ وہ کچھ اکتائے ہوئے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں ڈیڑھ بج چکے تھے۔

Akram Allahabadi

یقیناً اب تک فوجی رضا کاروں کی پارٹی آگے جا کر لوٹ آئی ہوگی۔اس خیال وہ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ اس کھنڈر کے قریب سے گزرنے لگا جو اپنے ماضی کو ایک خوبصورت عمارت ہونے کا آئینہ دکھا رہا تھا۔اس کھنڈر کا شکستہ ورانڈہ زمین میں دھنے کی وجہ سے زمین سے تقریباً ہموار ہوگیا تھا اور ملبے کے ڈھیر ورانڈے سے لڑھک کر باہر تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس ورانڈے کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک وہ ٹھٹک گیا۔یہ کیا؟ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ایک سفید خوبصورت سا ہاتھ جیسے کوئی اس ملبے اور اس پر پڑی ہوئی وزنی میانوں کے نیچے دب کر رہ گیا ہو۔صرف ملبے کے ڈھیر میں دبا ہوا ایک خوبصورت ہاتھ باہر جھانک رہا تھا۔آثار سے کسی عورت یا جوان لڑکی کا معلوم ہوتا تھا۔اس امکان کے باوجود کہ دبنے والا کسی صورت زندہ تو ہوگا نہیں، وہ اسے اس ملبے کے ڈھیر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔لیکن وہ میانیں اس کے بس کی نہ تھیں۔وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اور اوپر سے انھیں ہٹائے بغیر اس لاش کو نکالا نہ جا سکتا تھا۔روپ نے سوچا، ساتھیوں کو بلا لیا جائے تو بہتر ہے۔چنانچہ وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر اس ٹیلے کی طرف تیز تیز قدم چل دیا جہاں چٹرجی اور دوسرے ساتھی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور فوجی رضا کاروں کی پارٹی ابھی تک لوٹ کر نہ آئی تھی۔ان کے پاس ہی کچھ فاصلے پر ننگلی ناتھ اپنا اسٹریچر بچھائے اس پر لیٹا لیٹا ان کا کھیل دیکھ رہا تھا اور وہیں سے چیخ رہا تھا۔

''نرمل گدھا ہے، چٹرجی کو کھیلنا نہیں آتا۔'' روپ کو تیزی سے اس طرف آتے دیکھ کر وہ وہیں سے بولا۔(صفحہ نمبر ۲۶ اور ۲۷ نہیں ہیں)

مردہ چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھومنے لگا اور اس کے شعور کی سطح پر رکے ہوئے ریکارڈ کی طرح ایک ہی خاموش فکر رینگنے لگی۔''کاش یہ زندہ ہوتی۔''

کثرت رائے یہی رہی کہ کیونکہ آثار سے لڑکی ہندو ہی معلوم ہوتی ہے، اس لیے اسے چتا جلا کر پھونک دیا جائے۔

Akram Allahabadi

چٹر جی بولا۔ ''بہتر ہے کہ اسے وہیں ٹیلے پر لے جا کر چتا تیار کرو۔ وہاں بہت سے خشک لکڑیاں پڑی ہیں اور درخت بھی گرا پڑا ہے۔ اور پھر وہ ملٹری کے والنٹیر بھی تو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے وہیں آئیں گے۔ نہ پا کر چلے گئے تو پیدل چلتے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔''

چٹر جی کی رائے سے سب نے اتفاق کیا، مگر ہنگلی ناتھ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کچھ اور سوچنے لگا۔ اور شاید جو وہ سوچ رہا تھا وہی ہوا۔ بوس نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں ہنگلی ناتھ کا اسٹریچر ارتھی کے کام آئے گا۔''

''چل ہٹ، جیسے تیرے باپ کا ہے۔'' ہنگلی ناتھ زور سے اچھل کر چیخا۔

''تجویز بہت معقول ہے۔'' روپ بھی بول پڑا۔

اب بھلا سب کے مقابلے میں اکیلے ہنگلی ناتھ کی کیا چلتی۔ زبردستی اس سے اسٹریچر چھین لیا گیا۔ وہ روتا رہا، چیختا رہا۔ ''ارے کنجو! ماں نے میری پیدائش کے وقت یہ اسٹریچر میرے لیے بنوایا تھا، اس کا ستیاناس نہ کرو۔''

بوس بولا۔ ''ہنگلی، تو تو ایسا ہائے واویلا کرتا چل رہا ہے جیسے تیری ہی گھروالی مرگئی ہو۔''

''ہاٹ...'' ہنگلی گھروالی کے نام پر بھڑک کر بہٹ کو لمبا کر کے چیخا۔ ''بوس، ایسا مذاق کیا تو تیری بھی چتا یہیں تیار کر دوں گا۔''

بوس نے کہا۔ ''مگر دوسرا اسٹریچر تو نہیں ہے، مجھے لے کس طرح چلو گے؟''

آگے سے چٹر جی کی آواز آئی۔ ''ارے بھئی، چیونٹیوں کی طرح کیا رینگ رہے ہو، چلو نا تیز تیز۔''

بوس اور ہنگلی ناتھ اسی طرح آپس میں تو تو میں میں کرتے ذرا تیز چلنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

انھوں نے اسٹریچر کو ٹیلے پر لا کر ایک صاف جگہ رکھ دیا۔ پھر وہ گرے ہوئے درختوں سے خشک شاخیں توڑ توڑ کر اکٹھا کرنے لگے۔ بوس بولا۔

''اس طرح کی چتا تو جلدی نہ جل سکے گی۔''

''اگر پٹرول استعمال کیا جائے تو؟'' چٹر جی نے مشورہ دیا۔

''اس وقت تو یہی ایک راستہ ہے، مگر پٹرول ہے کہاں؟'' روپ بولا۔

''ہنگلی ناتھ کو بھیجو، اپنا ٹرک وہاں کھڑا ہے نا پھٹی ہوئی سڑک کے کنارے اس میں سے گیلن والا ٹن لے آئے گا۔'' بوس نے رائے دی۔ اور ہنگلی ناتھ اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''اے بوس، ہنگلی تیرے باپ کو نوکر نہیں ہے۔ بڑی ہمدردی ہے مرنے والی سے تو جا کر خود لے آ۔''

بوس ہنسنے لگا۔ روپ نے کہا۔ ''میں چلا جاتا ہوں۔''

''نہیں میں جاؤں گا، میں جلدی لے آؤں گا'' چٹر جی یہ کہہ کر کسی کی سنے بغیر چل دیا۔ اور سب ایک طرف ڈھلوان پر بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

صرف پندرہ منٹ بعد چٹر جی آ پہنچا۔ وہ تیز چلنے میں ماہر تھا۔ پہلے وہ کالج بھی پیدل ہی جایا کرتا تھا اور جب کسی دن دیر ہو جاتی تو آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کم اس کی چال نہ ہوتی۔

چٹر جی کے آتے آتے چتا بالکل تیار تھی۔ تھی کی جگہ اس خوبصورت لڑکی کی چتا پر پٹرول چھڑک کر آگ لگائی گئی اور ہر ایک اپنے اندر اس کار ثواب پر ایک ہلکی سی تسکین کے ساتھ ہی ایک خوبصورت احساس بھی چھپائے رہا۔ ''کاش یہ خوبصورت لڑکی زندہ ہوتی۔ کاش یہ اس طرح نہ مرتی۔'' مگر وہ مر چکی تھی اور اس کی چتا دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔

Akram Allahabadi

اسٹوڈینٹس کے موڈ بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں۔اس احساس کو دور کرنے کے لیے وہ چتا سے دور ہٹ کر ٹیلے کے دوسرے سرے پر تاش کھیلنے لگے۔لیکن روپ کچھ نہ بول سکا تھا۔ اس لاش کی برآمدگی سے اب تک کا وقفہ مرنے والی کے وہ حسین نقش ونگار، مردہ چہرے پر ایک عجیب سی معصومت۔اور وہ سوچ جا رہا تھا وہ کیوں مرگئی۔لوگ کیوں مرتے ہیں اور مرنا ہی ہے تو اچانک اس طرح کیوں مر جاتے ہیں۔یہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔اور آتے ہیں تو ان کی زد میں ان بن کھلی معصوم کلیوں کو کیوں آنا پڑتا ہے۔ان کی قیامت میں یہ بے گناہ آبادیاں کیوں کھنڈروں میں بدل جاتی ہیں۔یہ زلزلے امریکہ میں کیوں نہیں آتے، جہاں نسلی امتیاز کے سفید بھوت کوکلکس کلاں والے محض اتنے سے قصور پر کالے آدمیوں کو زندہ صلیب پر ٹانک کر جلا دیتے ہیں کہ انھوں نے بھی سفید آدمیوں کی طرح انسان ہونے کا خیال کیا تھا۔یہ زلزلے جنوبی افریقہ میں کیوں نہیں آتے، جہاں سفید دیو بے گناہ غریب کالے آدمیوں کو زندہ نگل جاتے ہیں۔یہ زلزلے ملایا میں کیوں نہیں آتے، جہاں جان مل سڑکوں پر انسان کا خون چوستا پھرتا ہے۔

مگر زلزلہ آسام میں آیا تھا، جہاں بھوکے ننگے سادہ لوح قبائلی بستے تھے، جہاں بمبئی اور کلکتہ کی طرح عیاشیوں کے بڑے بڑے اڈے اور کروڑ پتیوں کے بڑے بڑے محل نہیں تھے۔جہاں مکاری، سیاست اور مصلحت کا نقاب اوڑھ کر بازاروں میں نہیں ناچتی پھرتی تھی۔ مگر پھر بھی اسے یہ سب کچھ سوچنے کا حق نہ تھا۔یہ قیامت صغریٰ تو قدرت نے بھیجی تھی۔کیوں؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا، کوئی نہیں پوچھ سکتا۔انسان کا کام تو صرف عبودیت ہے۔شکوہ کا حق تو ان کو ہے جو یہ پوچھ سکیں کہ آج کے کاروبار میں فائدہ دس لاکھ کی جگہ دو لاکھ ہی کیوں ہوا۔یہ ظلم، او بھگوان۔

اور نفسیات کا یہ پاگل طالب علم اب بھی سوچ جا رہا تھا۔پیچھے سو قدم کے فاصلے پر اس خوبصورت لڑکی کی چتا بھڑک رہی تھی اور اسی طرح دوپہر ڈھلتی گئی۔زرد سورج مغرب میں

•۱۱ ڈگری کا زاویہ بنانے لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک زور سے اچھل پڑا۔ اس کی نظر اتفاق سے چتا پر پڑ گئی تھی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ چتا سے شعلے اور دھواں بلند ہو رہے تھے اور چتا کے قریب ہی دوسری طرف وہ کھڑی غور سے اپنی لاش دیکھ رہی تھی۔ وہی لڑکی۔ بالکل سفید سے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی۔ اور اس کے لمبے کھلے ہوئے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ سمجھا آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ شاید شدت احساس نے وہم کو متشکل کر دیا ہے۔ مگر جب اس نے دونوں آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا تو وہ پھر بھی اپنی چتا کے پاس کھڑی تھی۔ روپ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن جیسے اس نے دیکھ لیا ہو۔ وہ کھڑے کھڑے چونک پڑی۔ اس کی نظر روپ پر تھی اور اس کے ساتھ ہی چتا کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ ہوا کا جھونکا آیا تو دھواں اور بھبک کر اڑا اور وہ روپوش ہو گئی۔

دوسرے لمحے جب مخالف ہوا کے جھونکے نے دھویں کا رخ پھیرا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ صرف چتا کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مگر وہ تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کا دل نہ مانا چٹر جی کے پاس پہنچ کر وہ بیٹھ گیا اور اس نے چٹر جی کو آنکھوں دیکھی بات بتا دی۔ چٹر جی زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ ہنگل ناتھ تو اچھل کر لیٹ گیا اور منہ بنا کر بولا۔

"ہر ماہر نفسیات پورا پاگل ہوتا ہے اور نفسیات کا ہر طالب علم آدھا پاگل۔"

سب ہی ہنسنے لگے۔ چٹر جی بولا۔ "روپ، یہ تمہارا وہم ہے۔ تعجب ہے کہ تم ایم اے کے طالب علم ہو کر ایسی واہیات باتیں کرتے ہو۔"

"نہیں مانتے؟" روپ سنجیدگی سے بولا۔

"ماننے والی بات ہو تو۔" چٹر جی ہنس پڑا۔

روپ کو ساتھیوں کی یہ ہنسی بہت تلخ لگی۔ اس پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا، حالانکہ سب جانتے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ وہ تو آنکھوں دیکھی کہہ رہا تھا۔ مگر سب مخالف کیوں

کریں گے۔

"کیا واقعی یہ ممکن نہیں کہ یہ شدتِ تصور کا عکس رہا ہو۔" اس کا دماغ پریشان سا ہو گیا۔ وہ ان لوگوں کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے بیان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ چتا کے سامنے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح دماغ اور پریشان ہوتا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو، روپ؟" چٹر جی بازی پر تاش کا پتا پھینکتے ہوئے بولا۔

کہیں نہیں، تم کھیلو، میں ذرا ٹہلوں گا۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے برخوردار کا۔" ہنگلی نے ادھ جلی سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر کہا۔

"تو چپ رہ، نہیں تو ایک گھونسے میں بتیسی باہر آ جائے گی۔" چٹر جی بگڑ گیا۔

"ارے ارے باپ، تو بڑا، بس۔" ہنگلی نے اس کا وار ہاتھوں پہ ہی روک لیا اور چٹر جی ہنس پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

روپ ٹہلتا ہوا پھر اسی کھنڈر کے سامنے جا بیٹھا۔ اسی جگہ جہاں پہلے وہ چٹان پر بیٹھا تھا۔ یہ جگہ بلند اور کافی پرسکون تھی۔ اور سامنے وہی کھنڈر ویران پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا، جس کے شکستہ ورانڈے کے ملبے سے اس لڑکی کی لاش نکالی گئی تھی۔

مگر حساس طبیعت سوچنے سے کب باز آتی ہے۔ بلندی سے صاف نظر آنے والے موت کے شہر میں دور تک پھیلے ہوئے ان کھنڈروں کو دیکھ کر وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔

چند دن پہلے ڈیرو گڑھ کا یہ قصبہ کتنا آباد اور زندہ رہا ہوگا۔ بھرے بھرے بازار اونچی نیچی عمارتیں، وسیع اور تنگ سڑکیں، رنگ برنگے آدمی، بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان کمسن،

Akram Allahabadi

بوڑھیاں، مویشی، گاڑیاں اور زندگی کے بے شمار سستے مہنگے کھلونے۔ سب کچھ۔ ایک زندہ اور چلتے پھرتے شہر کی رونق... اور سوچتے ہی سوچتے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ایک چھٹے حواس کی کیفیت جو عالمِ خواب و بیدار کے بین بین تھی۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ بہت مستغرق کچھ سوچ رہا تھا، کچھ دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی نظروں کے سامنے یہ موت کا شہر زندہ ہونے لگا۔ گرے ہوئے درخت سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ پھٹے ہوئے ٹیلے سالم ہو گئے۔ دری ہوئی زمین ہموار ہو گئی اور موت کے سائے میں دور تک پھیلے ہوئے کھنڈر اپنی چولیاں بدلنے لگے۔ اس کی متحرک نظر کے ساتھ وہ صحیح و سالم مکانوں اور عمارتوں میں تبدیل ہو گئے۔ جیسے سنڈریلا کی جادوگرنی اپنی پھول کی چھڑی چاروں طرف گھما رہی ہو۔ اور پھر سارا ڈیرہ وگڑھ زندہ ہو گیا۔ پورا قصبہ جاگ اٹھا۔

سڑکوں پر چہل پہل نظر آنے لگی۔ آدمی عورتیں، بچے، گھوڑے، گاڑیاں، دکانیں، کھیل تماشے ہر چیز متحرک، زندگی ہی زندگی۔ کتنا پرسکون مقام، کتنی سہانی زندگی اور پھر اس کی نظر اس سامنے والے کھنڈر پر پڑی۔ آثار سے یہ کوئی خوبصورت سا بنگلہ رہا ہوگا اور واقعی وہ بنگلے میں تبدیل ہو گیا اور وہ لڑکی، وہ ضرور اسی مکان کی بیٹی ہوگی۔ شریف ماں باپ کی نازوں کی پالی خوبصورت بیٹی۔ یقیناً وہ اچھے شوق رکھتی ہوگی۔ اور روپ کی متجسس نگاہیں اندر تک پہنچ گئیں۔ شفاف پتھریلے فرش والے ورانڈے سے گزر کر، جہاں سائبان میں چھوٹے چھوٹے پھول دار پودے کنڈیوں میں ٹنگے جھوم رہے تھے۔ اس کی نگاہیں سامنے والے بڑے والان میں پہنچ گئیں جس کی بغل سے اوپر کی سیڑھیاں گئی تھیں۔ (صفحات ۲۶،۲۵ اور ۲۷ نہیں ہیں)۔

جس پر وہ بیٹھی تھی۔ اگر وہ اسے مل گیا تو اس کی غیر معمولی قوتِ متخیلہ کی تصدیق ہو جائے گی اور پھر کوئی اس کا مذاق نہ اڑا سکے گا۔

یہ سوچ کر وہ ورانڈے کو پار کرتا ہوا شکستہ والان میں داخل ہونے لگا۔ اچانک پھر روحوں کا تخیل اس کے دماغ سے ٹکرا گیا۔ وہ چتا والا واقعہ اور اس کے دماغ میں پھر ایک سنسنی سی

Akram Allahabadi

دوڑنے لگی۔تو کیا وہ اس لڑکی کی روح تھی؟

ڈاکٹر سیگمنڈ فرائیڈ کے فلسفۂ تحلیل نفسی کا طالب علم ہوتے ہوئے وہ اپنے مذاق کے مطابق سر اولیور لاج کے فلسفۂ روحانیت کے مطالعے سے بھی کافی متاثر تھا اور اسی وجہ سے وہ روحوں کے وجود کا قائل تھا۔حالانکہ دونوں فلسفے تقریباً ایک دوسرے کی ضد تھے۔یہی کچھ سوچتا ہوا ابھی وہ اندر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ نہ جانے کیا شے اس کے پیروں کے قریب سے سرسراتی ہوئی گزری۔وہ کسی خیال سے ایک دم چونک سا پڑا۔اور تھی بھی اچنبھے کی بات۔ابھی تک سوائے اسے اپنے لوگوں کے کوئی جان دار شے اس شہر خموشاں میں دکھائی نہیں پڑی تھی۔پھر یہ سرسراہٹ اور جھجکتی ہوئی نظروں سے جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے تعطل کے بعد اس کے چپکے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ ایک ننھا سا چوہا اندر سے نکل کر بھاگا تھا۔شاید اجناس دبی رہ گئی ہوں گی۔اور وہ اپنے خوف وشک پر کسی قدر خفیف سا پھر اندر کی طرف بڑھنے لگا۔دو ہی قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔سامنے کا دالان نما حصہ شکستہ ہو جانے کی وجہ سے پچھلے بڑے کمرے سے مل گیا تھا جس کی داہنی دیوار آدھی منہدم ہو چکی تھی۔بائیں سمت ایک نیم تاریک سی کوٹھری تھی، جس کی ایک دیوار اور چھت کا کونا ٹوٹ کر ملبے میں تبدیل ہو گئے تھے۔معلوم ہوتا تھا یہ کوٹھری بہت کم استعمال کی گئی ہوگی، کیونکہ اس کے کونوں میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے اور کارنس جگہ جگہ سے ٹوٹی تھی۔

اس کے مشرقی حصے میں گہرا اندھیرا تھا کیونکہ روشنی کا وہاں گزر نہیں تھا۔ٹوٹے ہوئے ہال کے مغربی سرے پر اندر کی طرف اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں جو کئی جگہ سے شکستہ ہونے کے باوجود اوپر تک پہنچانے کے قابل تھیں۔اوپر کی چھت کا صرف ایک کونہ سلامت رہ گیا تھا۔دالان سے آگے والے بڑے کمرے کی پشتی دیواروں میں تنگ و دراز شگاف پڑ گئے تھے، جن میں سے پہاڑوں کی آوارہ ہوا سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔اس سنسناہٹ میں ایک بھیانک قسم کی موسیقیت تھی اور اس کھنڈر میں داخل ہونے کے بعد اس کی ویرانی اس کی شکستگی

Akram Allahabadi

اور اس کی اداس فضا نے روپ کے دل پر ایک طرح کی آسیبیت طاری کر دی تھی۔ وہ اوپر سے مطمئن اور اندر سے متذبذب تھا۔ وہ برآمدے سے گزر کر ہال میں داخل ہو گیا۔ سامنے کچھ پتھروں کے ٹکڑے پڑے تھے اس کے پرے ملبے کا ڈھیر تھا اور زینے کے نزدیک والا کھمبا جو گرنے سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اوپر ٹوٹی چھت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ چار قدم چل کر وہ بائیں سمت کی کوٹھری کے دروازے پر ٹھہر گیا پھر نہ جانے کیوں اس کے اندر داخل ہونے لگا۔ یہ جگہ کافی تاریک اور ڈراؤنی تھی، مگر وہ ابھی سیدھا کھڑا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ خوف سے اس کی رگیں تن گئیں۔ اس خوفناک اندھیرے میں اسے سامنے سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں گھور رہی تھیں۔ ان کی زرد چمک بہت ڈراؤنی تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا اور ان سے نظریں ملا کر سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی حرکت قلب جیسے رک گئی ہو۔ لیکن وہ کوئی بھی شے ہو کچھ بھی ہو آوارہ روحوں کے اس ماحول میں اس کے حواس کو لرزا دینے کے باوجود بے ضرر تھی۔ چند دبی دبی سانسوں کے بعد جب اس نے اپنے آپ پر کچھ قابو پایا تو اسے جیب میں پڑی ہوئی ماچس یاد آ گئی۔ ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر اس نے دیا سلائی نکال کر جلائی۔ سلائی کی روشنی پھیلتے ہی وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ سامنے ٹوٹی ہوئی کارنس پر بیٹھے ہوئے الو کی گول گول آنکھیں اس اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

"ہونہہ... الو سے ڈر گئے، واہ بیٹا روپ۔" وہ ہنگلی ناتھ کے مکالماتی انداز میں بڑبڑایا اور اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

ان اتفاقات کے باوجود ماحول کی سنسنی اس پر اثر انداز تھی اور وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔

ملبے کے ڈھیر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ایک دم ٹھٹک گیا۔ کوئی سیاہ سی چیز اس کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے بالکل قریب سے گزر کر آگے نکل گئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک بڑے قد کی سیاہ بلی تھی۔ بالکل سیاہ۔ اور وہ سیاہ بلیوں سے نہ جانے

کیوں گھبراتا تھا۔بلی نے کچھ دور جا کر اسے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔اس سے نگاہیں ملاتے ہی روپ کا دل تھرتھرا اٹھا۔اس کی آنکھیں زرد چمکیلی اور خوفناک تھیں۔لیکن ان سے بھی زیادہ خوفناک روپ کا وہ تصور تھا جو کسی نفسیاتی مقالے کی یادداشت سے اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔توہم پرست لوگ کہتے آئے ہیں کہ آوارہ روحیں اکثر دوپہر کے وقت سیاہ بلی یا سیاہ کتے کے روپ میں ویرانوں میں گھوما کرتی ہیں۔اس بلی کو دیکھ کر اس کے اندر کا وہم جاگ اٹھا۔

تو کیا یہ اسی کی روح ہے۔اس خیال سے اسے یکے بعد دیگرے دو تین پھریریاں آ گئیں۔سیاہ بلی،آوارہ روح اور یہی سوچتے ہوئے اس کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگیں۔یہاں تک کہ اٹھتی ہوئی پلکوں کی اوٹ سے اسے سامنے کی طرف کچھ سفیدی سی نظر آئی جو اس سے پہلے اس کی نظر میں نہ تھی۔اور پھر جیسے ہی اس نے سامنے دیکھا دہشت زدہ ہو کر وہ پچھلی دیوار سے جا ٹکا۔اس کا سارا بدن تھرتھر کانپ رہا تھا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔اس کے ماتھے پر پسینہ چھلک اٹھا۔سامنے ملبے کے ڈھیر کے اس طرف وہ اس کھمبے سے ٹکی کھڑی تھی۔سفید باریک لباس میں لپٹی ہوئی وہی لڑکی جسے خود اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹیلے پر چتا میں جلایا تھا۔وہی روح۔سر سے پیر تک وہی۔وہ ایک ٹک روپ کی طرف دیکھ رہی تھی اور روپ کی قوتِ گویائی تک سلب ہو چکی تھی۔

پھر اچانک اسے خیال آیا کہیں یہ بھی تو اس کے وہم و تصور کی شدت کی تشکیل نہیں۔ایک ڈھارس سی بندھی اس خیال سے اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنی کیفیت کا اندازہ کرنے کیلئے اپنی انگلی اپنے ہی دانتوں سے زور سے دبالی اور خود ہی تکلیف سے اچھل پڑا۔وہ جاگ رہا تھا۔یہ خواب نہ تھا۔یہ وہم بھی نہ تھا۔وہ ایک حقیقت کی طرح سامنے موجود تھی۔اس سے صرف دس قدم دور۔وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔وہی لڑکی۔وہی روح۔

اسے دانتوں میں انگلی دبا کر اچھلتے دیکھتے ہی وہ اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ایک باریک نقرئی قہقہہ جس میں باریک باریک سریلی گھنٹیوں کی گونج سمائی ہوئی تھی روپ کے

Akram Allahabadi

کانوں میں الجھ کر رہ گیا۔

مگر وہ اب وہاں نہ ٹھہر سکا۔اپنے سامنے اسی لڑکی کی روح کو موجود او رمتحرک دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔وہ دیوار کے سہارے کھسکتا ہوا ورانڈے تک پہنچا اور اس تیزی سے باہر نکل کر بھاگا کہ وہ ایک جگہ تو گرتے گرتے بچا۔اس سفید روح کے پراسرار نقرئی قہقہے دور تک اس کا پیچھا کرتے رہے اور وہ خوف کی وجہ سے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکا۔وہ منہ اٹھائے بھاگا جا رہا تھا۔بغیر کسی ٹھکانے۔بغیر ہوش۔

اور کافی دور جا کر اسے اس کے ساتھی مل گئے۔وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر روانہ ہو چکے تھے۔فوجی رضاکاروں کی پارٹی بھی واپسی پر ان سے مل گئی تھی۔

جب وہ ان کے قریب پہنچا تو اس کی سانس کسی قدر پھولی ہوئی تھی۔

"تم کہاں رہ گئے تھے، روپ؟" چٹرجی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"میں...میں...پھر بتاؤں گا۔" وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا پھر کوئی دورہ پڑا ہے؟" چٹرجی کی مسکراہٹ میں طنز تھا۔مگر اس وقت روپ نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ گہری خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتا ہوا ان کے قدم بہ قدم چلنے لگا جیسے اب بھی وہ سفید لڑکی کی روح اس کا پیچھا کر رہی ہو۔حالانکہ اب وہ پہلے کی طرح خوف زدہ نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆

کیمپ میں لوٹ کر وہ کسی سے کچھ کہے بغیر سیدھا اپنے خیمے میں چلا گیا۔

"اسے ہو کیا گیا ہے؟" ہنگلی ناتھ نے بوڑھی عورتوں کی طرح ہونٹ پر انگلی رکھ کر چٹرجی سے پوچھا۔

"روٹھا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔شاید ہم لوگوں کی ہنسی سے۔" یہ کہہ کر چٹرجی پاس

Akram Allahabadi

والے خیمے میں چلا گیا۔ جنگلی ہاتھ دروازے پر ہی سے بولا۔

"چائے ملے گی؟ میں بھی آؤں؟"

"اندر گھسے تو ٹانگ توڑ دوں گا۔ یہ تمہارے باپ کا بنایا ہوا کینٹین نہیں ہے۔"

چٹر جی نے جواب دیا اور پھر دروازے کا پردہ گرادیا۔ جنگلی ہاتھ اس کا جواب دیے بغیر ہی دوڑ کر پیچھے سے آنے والے اس فوجی رضا کار اوپندر سنگھ کے ساتھ ہو گیا تھا۔ جس سے ابھی ابھی اس نے دوستی گانٹھی تھی۔ کیونکہ وہ چائے کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ چائے بنانے کے لیے اسٹو بھی ساتھ لایا تھا۔ جنگلی ہاتھ کو یہ اس نے خود بتایا تھا اور تب ہی سے جنگلی ہاتھ اس سے زیادہ فراخ دلی سے مل رہا تھا، کیونکہ کھانے سے زیادہ اسے چائے پسند تھی اور بقول اس کے اس کے ساتھی سب اس معاملے میں نہایت کنجوس واقع ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

کیمپ

دور تک پھیلے ہوئے ہری گھاس وار ایک میدان نما خطہ پر جہاں تین طرف کچھ اونچے نیچے سایہ دار درخت کھڑے ہوئے تھے اور ایک طرف سے پتلی سی ندی یا شاید نالہ بہتا تھا جوان دنوں خشک پڑا ہوا تھا ان رضا کاروں کے دو کیمپ تھے۔ ایک فوجی ایک غیر فوجی۔ فوجی نظم و ضبط کی خاطر فوجی رضا کاروں کو ان سے کچھ علیحدہ تھے اور ان کے فرائض کسی دوسرے علاقے میں سونپے جا چکے تھے۔ وہ لوگ کچھ اپنے کام میں اس قدر منہمک یا پھر علیحدگی پسند نظر آتے تھے کہ ان میں سے کوئی ابھی تک ان رضا کاروں سے آکر ملا بھی نہ تھا البتہ کبھی کبھی کلکتہ یونیورسٹی کے رضا کاروں اور فوجی رضا کاروں کی مشترکہ بیٹھک ہو جاتی جس میں تھوڑی دیر کے لیے کچھ غمِ جاناں کے قصے چھڑ جاتے۔ کچھ تفریح رہتی کچھ یکجائیت اور پھر اپنے اپنے فرائض۔ آج ان بیٹھکوں میں نہ جانے کیوں روپ شریک نہیں ہوا۔ وہ اپنے خیمے سے بہت کم باہر نکلا تھا۔ چٹرجی کو اس نے بتا دیا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ سر بھاری ہے اور تنہائی چاہتا ہے۔ چٹرجی نے بھی ایسے میں اسے پریشان کرنا مناسب نہ جانا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، البتہ سر درد کی کچھ گولیاں اسے زبردستی چائے کے ساتھ کھلا دی تھیں۔ بنگالی اصطلاح میں چائے بھی کھائی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اس میدانی خطے کی زمین بالکل ہموار بھی نہ تھی اور رضا کاروں کی رہائش کے لیے نصب کردہ خیموں کے ارد گرد ہری ہری جنگلی گھاس کافی اونچی تھی، جس میں شبنم کی نمی سے مچھروں کی پیداوار مسلسل ہوتی رہتی اور وہ راتوں کو اپنی ناخوشگوار بھنبھناہٹ سے تمام

Akram Allahabadi

رضا کاروں کو تنگ کیا کرتے ۔ دن کا وقت راتوں کی نسبت زیادہ پر سکون ہوتا کیونکہ رضا کار اپنے کاموں پر چلے جاتے اور کیمپ میں سناٹا چھا جاتا ۔ کسی قسم کا کوئی خطرہ یا چوری وغیرہ کا امکان بھی نہ تھا ۔ پھر بھی دو فوجی گارڈ پہلے کیمپ پر (غیر فوجی) اور دو گارڈ دوسرے کیمپ پر ہر وقت تعینات رہتے ۔ دو طرفہ قطاروں میں لگے ہوئے ان خیموں کے درمیان چھوٹی ہوئی کچی مگر صاف قدرے چوڑی سڑک کی سیدھ میں آگے ان رضا کار کیمپوں کے کمانڈر کا دفتر تھا جو ایک بھاری بھرکم، ہنس مکھ اور محنتی فوجی افسر تھا ۔ اس کے دونوں کندھوں پر شفاف اور کلف دار وردی کے اوپر دونوں طرف دو تاج لگے ہوئے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میجر کا عہدہ رکھتا ہے ۔ اس کا ایک اسسٹنٹ بھی تھا جو کپتان تھا اور اس کے کندھوں پر تین ستاروں کے نیچے I.E. انگریزی الفاظ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ہندوستانی انجینیر ہے ۔ آئی ۔ ای ۔ ملٹری انجینیرنگ کی فوجی اصطلاح میں ہندوستانی کمیشن کے فوجی انجینیر کو کہتے ہیں ۔ اس کا نام کیپٹن آنند تھا ۔ وہ غیر ضروری طور پر موٹا ہو گیا تھا، اس لیے مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا اور اس موٹاپے کے باوجود ہر کام محنت اور پھرتی سے کرتا تھا ۔ اسے فوجی رضا کاروں کی پارٹی کا چارج سپرد تھا جو تمام تر تقریباً ۷۵ رضا کاروں پر مشتمل تھی ۔ جن میں انجینیرنگ کے رضا کار کل سترہ تھے اور باقی دوسرے ۔ میجر کا نام فرہاد خان تھا اور وہ راجپوتانہ رائفلز فوجی یونٹ سے تعلق رکھتا تھا ۔ پھر بھی وہ اپنے نام کو کسی قدر انگریزیت کے ساتھ فرائیڈ کہتا اور کہلاتا ۔

دونوں کیمپوں کے کل سفری خیمے ۱۰۰ سے زیادہ نہ تھے ۔ ان میں کلکتہ یونیورسٹی والے رضا کاروں کے قبضے میں صرف ۱۰ آئے تھے، جن میں سے آپس کی رضامندی کے ساتھ روپ کو ایک علیحدہ خیمہ اکیلے رہنے کے لیے دے دیا گیا تھا اور تھا بھی وہ چھوٹا سا ۔ دوسرے تمام خیمے اس سے بڑے ہی تھے ۔ کھانے پینے کا انتظام ان لوگوں نے اپنے طور پر کر لیا تھا اور کمانڈر چاہتا تھا کہ یہ لوگ بھی فوجی رضا کروں کے میس (mess) سے کھائیں ۔ بہر حال ان تمام فوجی و غیر فوجی رضا کاروں پر مشتمل یہ کیمپ ڈبرو گڑھ رضا کار کیمپ کہلاتا تھا ۔ کیمپ کے شمال

Akram Allahabadi

مغربی سمت میں ہی کچھ ڈھلوان کے بعد پتھریلی چٹانوں اور ان کے بیچ بیچ مٹی کے ٹیلوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔حتا کہ وہ آبادی کے آثار سے جا کر منسلک ہو جاتا تھا۔البتہ درمیان میں کہیں کہیں پہاڑی نالے، کہیں گنجان درخت آجاتے۔بہرحال کیمپ کے شمال مغربی کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے بہت دور، بہت مدھم سے اس موت کے شہر کے آثار دکھائی دیتے تھے، جن سے اور کسی کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، مگر روپ کے ذہن سے وہ فراموش ہی نہ ہوئے تھے۔اگر چہ فوجی رضا کاروں نے بیلچوں کی مدد سے زمین کو کافی صاف بھی کر ڈالا تھا، لیکن جنوب کی سمت کیمپ کے پیچھے جنگلی جھاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ اب بھی موجود تھا جہاں رات کے وقت بھیانک تاریکی چھائی رہتی اور اسی تاریکی کے اوٹ سے جنگلی جانوروں، سیاروں اور رات کو اڑانے والے کیڑوں کی ملی جلی آوازیں اکثر سنائی دیا کرتیں، جس سے رات کو سوئے ہوئے ان کیمپوں کی فضا کسی قدر روحانی اور کسی قدر بھیانک معلوم ہوتی۔

روپ جب سے واپس آیا تھا خاموش سا اپنے اس اسٹریچر پر لیٹا تھا جو لوہے کی تو تہ دار (فولڈنگ) ڈنڈیوں سے بنایا گیا تھا۔یہ اسٹریچ کیمپ کمانڈر کی طرف سے رضا کاروں میں تقسیم کیے گئے تھے اور فوجی ملکیت تھے۔یہ ہنگلی ناتھ کے اس اسٹریچر سے مختلف تھے جو موت کے شہر میں کھنڈروں والی اس خوبصورت لاش کی ارتھی کی حیثیت سے کام میں لایا گیا تھا۔بہت دیر تک وہ خاموش پڑا آج کے محیر العقل حادثے کے بارے میں سوچتا رہا۔سب کچھ اس نے اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھا تھا جن سے اب بھی وہ اپنے سامنے والی ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔تو کیا واقعی وہ ایک روح تھی۔اور زندگی میں پہلی بار ایک خوبصورت مگر مردہ جسم کو آنکھوں کے سامنے حرکت کرتے، ہنستے، آنکھوں کی پتلیاں بھی گھماتے دیکھ کر اس کے اوسان اب تک بہک رہے تھے۔وہ دیکھے ہوئے پر بھی یقین نہ کرنا چاہتا تھا، مگر یقین کرنے پر مجبور تھا۔کیونکہ آنکھوں دیکھا تھا۔وہ بہت دیر تک کروٹیں بدل بدل کر سوچتا رہا۔

"وہ کیوں آئی؟"

Akram Allahabadi

"مرنے کے بعد وہ پھر مجسم و متحرک کیسے ہو گئی؟"

"اس روح کو کسی اور نے کیوں نہ دیکھا؟"

"وہ صرف اسی کے سامنے کیوں ظاہر ہوئی؟"

"وہ اس کھنڈر میں کیوں موجود تھی؟"

"اور وہ ہے کون؟"

ان تمام سوالوں کا جواب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ کھنڈر میں اس کے موجود ہونے کی جائز وجہ صرف یہی ہو سکتی تھی کہ وہیں اسی جگہ اس کے جسم کی موت ہوئی تھی۔ وہیں سے اس کی لاش نکالی گئی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگا۔

"کیا روحیں خاکی جسم کو چھوڑ کر بھی مجسم اور متحرک دکھائی دے سکتی ہیں؟"

"اور کیا وہ موت کے بعد بھی اس قدر مطمئن اور آزاد رہ سکتی ہیں؟"

یہ سوالات اس کے ذہن میں ابھرے اور ڈوب گئے۔ جن انہونی باتوں کے لامتناہی سلسلے کا کوئی جواب ہی نہ ہو، ان پر کہاں تک سوچا جائے۔ اور پھر وہ کوئی ماہرِ روحانیات بھی تو نہ تھا۔ البتہ سر اولیور لاج کے فلسفۂ روحانیت کے سلسلے میں وہم و یقین کی ایک بحث میں اس نے بڑے بوڑھوں کے چند مشہور اقوال ضرور پڑھے تھے جو اب تک اسے یاد تھے اور جوان روحوں سے متعلق تھے جو بقول سر لاج دنیا میں باقی رہ جانے والے اپنے کسی گہرے تعلق کی خاطر عالمِ موجودات میں بھٹکتی رہتی ہیں اور جن کے بارے میں لوگوں میں طرح طرح کی روایتیں سنی جاتی ہیں۔ جیسے آوارہ روحیں اکثر اندھیری راتوں کو یا دوپہر کے سناٹوں میں ویران مقامات پر اپنی شکل میں یا پھر سیاہ کتوں یا بلیوں کی شکل میں گھوما کرتی ہیں۔

"روحیں ہوا ہوتی ہیں، مگر نظر آ سکتی ہیں۔"

"روحوں کا وجود ہے، مگر ٹھوس نہیں۔"

اور خود سر اولیور لاج کا تجدیدِ حیات (Re-incornation) پر مقولہ تھا کہ بعض

Akram Allahabadi

روحوں کا دنیا میں لوٹ آنا بعید از قیاس نہیں ہے۔یادداشت کے خانے سے ان حوالوں نے اس کے خیالات کی کسی قدر تصدیق کردی۔اگرچہ نفسیاتی طالبِ علم کی حیثیت سے فرائڈ کے فلسفۂ تحلیل نفسی کی بنیاد پر اسے ان اثرات کو قبول کرنے سے انکار کردینا چاہیے تھا۔کیونکہ فرائڈ کے نزدیک کوئی مافوق الفطرت نظارہ (vision or illusion) عدمِ احساس کی عکسی تشکیل ہی ہوسکتا ہے۔اور بعض اوقات شعور تحتی میں چھپی ہوئی بالکل فراموش کردہ شکل، یا دیا کرید لاشعوری طور پر نگاہوں میں متمکن ہوجاتی ہے، مگر وہ خود اس کی خوبصورت انفرادیت اور حادثے کے اتفاقی اثرات سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ سراولیور لاج کی روحانیت اس کے ذہن میں اپنے استاد فرائڈ کے تیقّن پر غالب آ گئی اور وہ سوچنے لگا جو کچھ ہوا بغیر اصلیت نہ ہوگا۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایک روح ہے، کاش وہ کوئی زندہ حقیقت ہوتی۔

لیکن نہ جانے کیوں وہ یہ سوچ کر کچھ بے چین سا ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ روحیں ہوا ہوتی ہیں۔اس کا خوبصورت پیکر بھی محض ہوا ہوگا۔لاشعوری طور پر وہ اس خیال سے متاثر سا ہوگیا، جیسے اسے اس روح کا ایسا ہوا اچھا نہ لگا ہو۔جیسے... جیسے وہ چاہتا ہو کہ... مگر اس منزل پر پہنچ کر وہ ایک دم لرز گیا۔اس کا دماغ بھی کیسی کیسی الٹی اور بھیانک باتیں سوچنے لگا تھا۔بھلا ایک روح سے ملاپ؟ ایک مردہ خواہ ٹھوس ہی بن کر سامنے کیوں نہ آجائے۔اور ایک بار اسے سر سے پیر تک جھرجھری سی آ گئی۔

جذباتی طور پر کسی تخیلی شے سے بھی متاثر ہوکر انسان کیسی کیسی عجیب باتیں سوچنے لگتا ہے۔وہ اپنے آپ پر دوچار بار لعنت بھیجتا ہوا اندر سے کسی قدر مطمئن، کسی قدر سہما ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

نہ جانے کیوں، یا شاید نفسیاتی طور پر وہ آج کی ہر چیز بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی وہی کچھ سوچنے پر مجبور تھا جو بھولنا چاہتا تھا۔پھر اسے خیال ہوا شاید تنہائی اس پر ان خیالات کو حاوی کررہی ہے۔

Akram Allahabadi

چنانچہ وہ خیمے سے باہر نکل آیا اور ٹہلتا ٹہلتا کیمپ کے پیچھے دور ایک درخت کے سائے میں جا کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ خاموش اور کھویا ہوا۔ مگر چٹرجی نے پیچھے سے آ کر اسے ایک دم چونکا دیا۔

''ایسے کیا کھوئے کھوئے سے ہو آج روپ؟'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ مختصر سا جواب دے کر رہ گیا۔

''تمہیں بتانا ہوگا۔ آخر میں کوئی دشمن تو نہیں ہوں تمہارا۔'' چٹرجی نے منہ لٹکا لیا۔

''میری باتوں پر یقین بھی نہیں کرتے اور ہمدردی بھی جتاتے ہو۔'' روپ نے رخ دوسری طرف کر کے جواب دیا۔

''تم جو کہنا چاہتے ہو اسے میں تمہاری ضد کی خاطر چاہو تو مان لوں، لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ وہ تمہارا وہم ہے۔ وہم جب شدید ہو جاتا ہے تو بعض وقت منظر کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ احساس ہی تو یقین کا جنم داتا ہے۔'' چٹرجی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک متحرک حقیقت کی طرح دیکھا ہوا ہے میں وہم کی تشکیل ماننے کو تیار نہیں۔ سر اولیور لاج نے خود فلسفۂ روحانیت میں لکھا ہے کہ وہ روحیں جن کا اس دنیا سے کوئی گہرا تعلق رہ جاتا ہے، اکثر دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔'' روپ اس سے بحث کرنے لگا۔

''کچھ بھی سہی بالآخر تمہیں قائل ہونا پڑے گا۔ تعجب ہے کہ تم نفسیات کے ایم۔اے۔ کے طالبِ علم ہو اور ان توہمات پر یقین رکھتے ہو، جنھیں تمھیں خود جھٹلانا چاہیے۔'' چٹرجی بولا۔

''لیکن...'' روپ نے کہنا چاہا۔

''پھر وہی۔ میں کہتا ہوں یہ دیوانگی ہے۔ تم جس قدر شدت سے ایک خیال کو اپناؤ

Akram Allahabadi

گے وہ اسی قدر تم پر مسلط ہوتا جائے گا۔" چٹرجی نے اسے بات نہیں کرنے دی۔

"خیر میں اس موضوع پر بحث نہیں کرونگا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ چائے پئیں گے۔" چٹرجی نے اسے بازو سے تھام لیا اور وہ بھی انکار کیے بغیر ساتھ ہولیا۔

چٹرجی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر کچھ دیر ہنگلی ناتھ کے مسخرے پن سے لطف اندوز ہوکر اور چائے وغیرہ پی کر جب وہ اپنے خیمے میں واپس آیا تو اس کے دل و دماغ پہلے کی بہ نسبت پرسکون تھے۔ وہ بڑی حد تک چٹرجی کی باتوں سے متاثر ہوکر آج کے واقعات کو بھلا چکا تھا۔ وہ اسے انتہائے تصور کی سییت کہہ کر دل کو تسکین دینا چاہتا تھا اور پھر اس نے اپنے اسٹریچر پر لیٹ کر کچھ ادھر ادھر کی سوچنے کی کوشش شروع کردی۔ اس وقت اسے بھوک بھی نہ تھی۔ ہنگلی ناتھ جب اسے کھانے کے لیے چلنے کی دعوت دیتا ہوا وہاں سے گزرا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ آج بھوک نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

رات کو جب سونے کے لیے وہ اپنے اسٹریچر پر لیٹا تو دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ اس وقت وہ نفسیاتی شعور پر اپنی قوت متخیلہ اور قوت ارادی میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زبردستی ان آسیبی واقعات کو بھول کر کلکتہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کلکتہ چوڑی شاندار اور جگمگاتی سڑکوں کے دونوں طرف بچھی ہوئی گھنی آبادی والا کلکتہ۔ کتنا لطف تھا اس شہری زندگی کی گہما گہمی میں لیکن کتنا سکون ہے اس ویران سے خاموش پہاڑی علاقے میں۔ اور بیچ میں ہری گھاس میں کہیں چھپے ہوئے ریسے کی جھناتی ہوئی ٹراہٹ کو دپڑی۔ یہ کمبخت انگلی سے چھوٹا جانور چیختا کس زور سے ہے۔ وہ پہلو بدل کر بڑبڑایا۔ دور کیمپوں کے اس پار پڑے ہوئے چھوٹے سے دیہاتی پڑاو پر کسی کی بھینس ڈکرائی۔ جب انسان جاگتا ہے تو یہ جاگتے

ہیں اور جب انسان سوتا ہے تب بھی یہ جاگتے ہیں۔عجیب بے تکی مخلوق ہے۔عجیب بے تکی۔ عجیب بے تکی۔اور ٹھنڈی ہکی ہواؤں کے نرم تھپیڑے سے لوریاں دینے لگے۔عجیب بے تکی.. عجیب بے تکی۔

وہ وہاں نہیں تھا،مگر وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔کھنڈر کے سامنے زمین میں دھنسی ہوئی چٹان اس وقت خالی پڑی تھی۔برگد کا بوڑھا پیڑ اسی طرح لاوارث اور خاموش لپٹا سو رہا تھا۔ لیکن ہواؤں میں ایک عجیب سی مدھم مدھم موسیقی بہنے لگی۔بڑی سریلی،بہت مدھم۔جیسے دور.. بہت دور بجتے ہوئے ساز آوارہ ہواؤں پر تیرتے چلے آ رہے ہوں۔حباب کی طرح اتنے آہستہ کہ ٹھیس نہ لگ جائے۔کہاں ہو تم؟ جیسے اس کے من کا تار بجا۔ہشت، چپ رہو۔اس نے اپنے آپ کو ڈانٹ دیا۔

مدھم موسیقی کی لہریں تیز تیز رینگنے لگیں۔ایک بار ہوا کے آنچل زور سے سرسرائے۔ سفید لہراہٹ پر اس کی آنکھیں جم گئیں۔وہی سفید آنچل سر سے پیر تک سفید لباس۔چاندنی کی طرح روشن اور گلاب کی طرح نکھرا ہوا چہرہ۔وہ آہستہ خرام نہ جانے کہاں سے اس طرف چلی آ رہی تھی۔بڑے مدھم مدھم سروں میں کچھ گنگناتی ہوئی اور شاید یہ اسی کی گنگناہٹ ہو کہ فضا میں کہیں ستار کے تار ٹنٹنانے لگے ہوں۔کہیں کہیں نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں ایک روشن ستارے کے قریب ٹھنڈا چاند بہہ رہا تھا اور دور تک موت کے شہر پر ایک رومان انگیز چاندنی کا سناٹا اس طرح لہرایا ہوا تھا جیسے مردے کے جسم پر سفید چادر اوڑھا دی گئی ہو۔اس روح پرور ٹھنڈی چاندنی میں بھی اس آسیب زدہ ماحول کا بھیانک پن اجاگر تھا۔دل کیف سے بھری سانس کھینچتے ہوئے ڈرتا تھا، مبادا مردے نہ جاگ اٹھیں اور گلا گھونٹ دیں۔وہ سانس روک کر دیکھتا رہا اور وہ سفید شفاف روح کسی تخیلی پرستان کی شہزادی کی طرح آہستہ آہستہ ناہموار زمین پر قدم رکھتی چٹان کے پاس سے گزرتی ہوئی کھنڈر کے نزدیک پہنچ گئی۔روح بھی اتنی لطیف اور پرکشش ہو سکتی ہے؟اس کا الجھا ہوا دماغ سوچنے لگا۔وہ اسی لڑکی کی روح تھی جو چاندنی رات

کے سناٹے میں اس موت کے شہر میں آوارہ گھوم رہی تھی۔ آوارہ روح۔

اسے جھرجھری سی آگئی۔ کمبل اور اوپر سرک گیا۔ سردی تو نہیں بڑھی تھی۔ وہ کچھ گا رہی تھی۔ شاید کسی کو کھینچ بلانے والا کوئی آفاقی گیت۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسی کھنڈر میں داخل ہوگئی۔ ٹوٹے ہوئے درودیوار کے شگافوں سے چاندنی کی مدقیلی کرنیں گزر کر مٹی اور ملبے کے بے ترتیب ڈھیروں پر بے سرپیر کے سایوں کی طرح تھرک رہی تھیں۔ اس لیے نہ جانے کیوں ایک بار ایک حسرت بھرے انداز سے پلٹ کر اس چٹان کی طرف دیکھا جہاں اس دن روپ بیٹھا تھا، مگر اس وقت وہاں نہ تھا۔ پھر بھی وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک لمبی سانس کھینچتی ہوئی اس کھنڈر میں داخل ہوگئی۔ یہاں اندھیرے اور چاندنی کے امتزاج یا ایک عجیب لطیف سا بھیانک پن طاری کر رکھا تھا۔ شہرِ خموشاں جسے بے نفس سناٹے میں رومانیت بھی کتنی پرہول ہوتی ہے۔ وہ اندر اسی کھمبے تک ٹک کر کھڑی ہوگئی جو شکستہ دالان میں اوپری چھت کے ایک ٹھہرے ہوئے کونے کو سر پر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ گنگناتی رہی اور دیوانی روحوں کی طرح ہرجائی ہوائیں جھومتی رہیں۔ پھر ہوائیں گنگنانے لگیں اور وہ کھڑی جھومتی رہی۔ چاند تاروں بھرے سمندر کے سطح پر تیرتے ہوئے کچھوے کی رفتار سے دور پہنچ چکا تھا۔ جب ایک آدھ بادل کا ٹکڑا آجاتا تو وہ اسے عبور کرنے کے لیے تیز تیز بھاگنے لگتا اور پھر ایک کاہل مسافر کی طرح وہی رفتار۔

ایک بار اور اس روح نے پلٹ کر اس پتھر کی چٹان کو دیکھا۔

مجھے ڈھونڈ رہی ہے، مگر کیوں؟ کیا کوئی لگاؤ ہے اسے؟ اور مجھے بھی تو نہیں۔ میں کیوں یہاں ہوں؟

مگر وہ کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی وہاں سے ہل نہ سکا جیسے اسے کسی نے بت بنا کر محض دیکھنے کے لیے کھڑا کیا تھا۔ پھر وہ ایک دردناک گنگناہٹ کے ساتھ ٹوٹی سیڑھیوں کو خلاء پر پیر رکھ کر عبور کرتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ چھت کے اس ٹکے ہوئے کونے پر جس پر روح کا

Akram Allahabadi

بوجھ شاید اس لیے نہ پڑے کہ ہوا ہو، لیکن ذرا سا بوجھ اسے نیچے لا سکتا تھا۔ اب وہ اتنی اونچائی پر چاندنی روشنی میں آدھی رات کو روم کے کسی ویران سے چوراہے پر اونچی نصب کردہ وینس کی سنگِ مرمر کی مورتی معلوم ہو رہی تھی، مگر چاند کی سیدھی پڑتی ہوئی کرنوں نے اس کے چہرے میں کتنی کشش پیدا کر دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اس چٹان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک ہوائیں طوفان کی موجوں کی طرح لہریں لینے لگیں۔ خلاؤں کی لاہوتی موسیقی کی گونج تیز تر ہوتی گئی۔

ایسا معلوم ہوا جیسے چاند نے ایک سیڑھی پھینکی ہو۔ اس نے ایک آواز دی۔ ایسی آواز جس پر روپ کا دل تڑپ کر سینے سے نکل بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے وہ صرف اسی کو بلا رہی ہے۔ یا اس کے اندر کی آتما کو۔ مگر وہ ہل نہ سکا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں اوپر کی طرف پھیلا دیے اور پھر وہ آسمان کی طرف گیس بھرے ہوئے ربڑ کے چھوٹے غبارے کی طرح اڑ گئی۔ حدِ نظر تک لہراتا ہوا ایک سفید سا عکس۔

آنکھ کھلی تو سویرا ہونے والا تھا۔ وہ سوچنے لگا خواب میں بھی وہی، لیکن کچھ بھی ہو وہ تھی کتنی حسین، کتنی پرکشش، مگر ایک روح۔ اس کا دل لرز گیا۔ یہ خواب بن مانگے کیوں مل جایا کرتے ہیں۔ اور وہ بھی بے سر پیر کے۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر فراغت کے بعد ٹینک سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھوئے۔ چٹرجی آ گیا اور اسے ساتھ لے کر ناشتے کے لیے مشترک میس میں چلا گیا۔ وہاں اپنی عادت کے مطابق ہنگلی ناتھ اودھم مچائے ہوئے تھا۔ کسی نے اس کے پیالے کی چائے نظر بچا کر آدھی انڈیل لی تھی۔ اور جس طرح شرابی کے ہاتھ سے شراب چھن جائے، وہ بری طرح پیر پٹک پٹک کے مچل رہا تھا۔

"بھگوان قسم، اگر ایک ایک کے بستر میں پہاڑی بچھو نہ گھسیڑ کر تو میرا نام ہنگلی ناتھ نہیں، ورنہ دے دو سید ھے سے میری چائے۔ بلکہ اس کا سود بھی لوں گا۔"

"ٹھنڈی جو ہو گئی ہوگی۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔

Akram Allahabadi

''بھئی دے کیوں نہیں دیتے۔ یہ کمبخت کہیں واقعی بچھو لے آیا تو مصیبت آ جائے گی۔'' چٹرجی نے کہا۔

''لائے گا کہاں سے برہما کی اولاد ہے کیا، پہلے اسی کو نہ کاٹیں گے۔'' بوس بیچ میں بول پڑا۔

''معلوم ہوتا ہے سب تیری ہی کارستانی ہے۔ بغل کا چور۔'' ہنگلی نے بوس پر الزام دے مارا۔

''اے ہنگلی، میرا نام لیا تو سر توڑ دوں گا تیرا۔'' بوس نے مصنوعی غصے کا اعلان کیا۔

''ہاں ہاں، لڑتے کیوں ہو، کنجوسو۔ تو میری چائے میں سے لے لو، ہنگلی۔'' روپ بیچ میں آ گیا۔

''ارے سالا مسخرا ہے۔ اپنی ساری چائے پی گیا اور چلا ہے ڈھونگ رچانے کسی نے آدھی پی لی۔'' بوس نے برا سا منہ بنا کر ہنگلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس کی مت سنو، روپ بھیا۔ بھگوان قسم ایک تو پہلے ہی مجھے چائے کم دی جاتی ہے اور پھر آدھی غائب۔ جانتے ہو میرا کیا حال ہو جاتا ہے چائے بغیر۔ مجھے تو کوئی سات دن دعوت نہ کھلائے، ایک دن چائے پلا دے۔'' ہنگلی نے پولسن کا استعمال روپ پر کرتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ، اس منحوس کو دعوت کون گدھا دے گا۔'' بوس آستین جھٹکتے ہوئے بیٹھ کر بولا۔

''منحوس تو تیرا...'' بگڑ کر ہنگلی نے کہنا چاہا۔

''باپ۔'' بوس نے خود ہی جملہ پورا کر دیا اور سب زور سے ہنس پڑے۔

ہنگلی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بعد میں سب نے اپنے اپنے حصوں میں سے تھوڑی تھوڑی چائے چندہ کر کے اسے دی اور وہ نہایت بے غیرت کے ساتھ انھیں منہ چڑا چڑا

Akram Allahabadi

کر سامنے ہی پیالہ خالی کر گیا۔

میس سے لوٹے تو سورج ۳۰ ڈگری تک بلند ہو چکا تھا۔ پونے نو بجے تھے۔ چٹرجی روپ کے خیمے میں آ گیا۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ چٹرجی نے جب اس کی الجھن کا سبب پوچھا تو اس نے رات کا تمام خواب بتا دیا۔ وہ سن کر بہت ہنسا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"پگلے، تم اپنے ہی واہمے سے شکست کھا رہے ہو۔ بھلا وہ روح، خواب اور تم سے عشق۔ تمہارا انتظار۔ کیا تسلسل ہے حماقتوں کا۔"

"مذاق مت اڑاؤ۔ میں نے خواب دیکھا تھا سو بیان کر دیا۔" روپ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"برا مان گئے۔ ارے بھئی، میں بھی تو خواب کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ اچھا دیکھو، تم خواب کو مانتے ہو؟" وہ پوچھنے لگا۔

"نہیں، صرف خلل دماغ کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔" روپ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بہر حال یہ بیوقوفی ہے اگر مانو تو۔ کیونکہ میں نے خود بھی کبھی عجیب عجیب خواب دیکھے ہیں۔ ایک رات میں نے دیکھا، میں ہاتھی کی دم سے لٹکا ہوا ہوں اور ہاتھی چیخ چیخ کر بازار میں بھاگ رہا ہے۔ ایک مرتبہ دیکھا ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز میرے بازو میں آ کر لپٹ گیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ کہتا تھا، 'پرستان چلو گے؟ میں نے کہا پتاجی سے پوچھ لوں'۔ حالانکہ پتاجی کب کے سورگ باشی ہو چکے تھے۔ ایک دن تو بالکل عجیب سا خواب دیکھا۔ بولو، کہہ دوں؟" وہ بہ مشکل اپنی ہنسی روک کر روپ کی شکل دیکھنے لگا۔

"ضرور کوئی عالی شان بے ہودگی بکو گے۔" روپ مسکرایا۔

"نہیں بھائی، میں نے دیکھا تم لڑکی ہو اور ماماجی، میرا مطلب ہے تمہاری ماتا جی، تمہیں دلہن بنا رہی ہیں۔ بارات آنے والی ہے اور تم بضد ہو کہ میں نہیں جاؤں گی، مجھے ڈر لگتا

ہے۔اتنے میں ایک موٹی سی جیٹھانی مٹکتی ہوئی آجاتی ہیں اور کہتی ہیں اے ہے میری چاندی بہو کہاں ہے، ذرا دیکھوں تو۔پھر اس وقت جو تم شرما کر منہ چھپاتے ہو تو اتنی زور سے میرا قہقہہ چھوٹ پڑا کہ گھبرا کر نیلا دروازے پر آ پہنچی، میری آنکھ کھل گئی تو میں جھینپ سا گیا۔"

"آپ کس پر اتنی زور سے ہنس رہے تھے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایسا خواب دیکھ رہا تھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہُنم، یہ تو تھا آپ کا خواب۔" روپ نے مسکراتے ہوئے ٹیڑھا سا منہ بنا کر ہاتھ اٹھایا۔

"ارے بھئی، جھوٹ بولوں تو شام کا کھانا نہ ملے، بس۔" چیٹر جی جلدی سے پیچھے ہٹ کر بول پڑا۔

"اچھا چیٹر جی، تمہیں بھی کبھی نیلا یاد آتی ہے؟" روپ ایک دم گفتگو کا رخ بدل کر پوچھ بیٹھا۔نہ جانے کیوں اس سوال پر چیٹر جی گھبرا گیا۔اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی، جیسے روپ نے کسی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔

"تمہیں مجھ سے ایسی بات نہیں پوچھنی چاہیے۔وہ تمہاری منگیتر ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس کے لہجے میں کپکپاہٹ سی تھی۔ہنستے ہنستے اچانک اتنا سنجیدہ بلکہ مغموم سا ہوتے روپ نے اسے کبھی نہ دیکھا۔ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ بڑی مشکل سے سینے میں کسی سلگتی ہوئی بھٹی کی گھٹی گھٹی سی بھاپ چھپائے ہوئے ہے جو ذرا سا ڈھکن اٹھنے پر ہی پنکچر ہو جانے والے ٹیوب کی ہوا کی طرح بھرا کر اڑ سکتی ہے۔روپ تو چاہتا تھا کہ چیٹر جی اس سے اپنے دل کا درد بتا دے لیکن چیٹر جی کی سنجیدہ اور جچی تلی گفتگو سے موقع ہی نہ دیتی تھی کہ وہ کہیں سے بات پکڑے۔بہر حال وہ پریشان سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" روپ نے کہا۔

"کیا کام پر نہ چلو گے آج؟" وہ لہجہ بدل کر بہت نرمی سے بولا۔

Akram Allahabadi

"آج میرے سر میں کچھ درد ہے، آج نہیں جاؤں گا اور پھر جانا کدھر ہے؟" روپ کہتے کہتے پوچھنے لگا۔

"ادھر مغربی ڈھلوان پر ایک علاقہ ہے، وہیں ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔" چٹرجی نے بتایا۔

"تو ٹھیک ہے، میں آج نہیں جاؤں گا۔ تم میرا عذر نامہ کیمپ کمانڈر کو پہنچا دینا۔ وہ چھٹی مان لیں گے" روپ نے کاغذ پر پنسل سے ایک پرچہ لکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"تمہاری مرضی، لیکن وہ سر درد کی گولیاں ضرور کھالینا، ورنہ میں شام کو آکر گنوں کہ کتنی رہ گئیں۔" چٹرجی یہ کہہ کر اس کا پرچہ لے کر چلا گیا۔

"واہ رے معصوم دوست۔" روپ نے لمبی سی سرد سانس کھینچی اور اسٹریچر پر ڈھیلا پڑ گیا۔

۱۱ بجے تک سب چلے گئے۔ اپنے ساتھیوں میں اکیلا وہی اپنے خیمے میں رہ گیا۔ کیمپ کمانڈر نے کہلوایا کہ اگر دوا کی ضرورت ہو تو پہنچوا دوں۔ روپ نے شکریہ کے ساتھ جواب بھیج دیا کہ میرے پاس سر درد کی گولیاں موجود ہیں۔

پھر کوئی نہیں آیا اور وہ تنہا اسٹریچر پر پڑا سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے خیال آگیا کہ آج نئی ڈیوٹی کا پہلا دن تھا، نہ جا کر اچھا نہیں کیا۔ آرام کرنے تو آیا نہیں یہاں۔ اس احساس کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بارہ بجے کے قریب کیمپ کمانڈر کے آفس پہنچا۔ وہ اتفاق سے موجود ہی تھا۔ روپ نے اس سے یہ کہہ کر کام پر جانے کی اجازت لے لی کہ اب سر درد ٹھیک ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس کا سر اب بھی کچھ کچھ درد کر رہا تھا۔ رضا کار سڑک پر پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ پیدل ہی اس طرف چل دیا۔ دفتر سے اس نے جگہ معلوم کر لی تھی۔ اسے سونے مقامات پر تنہا چلنے میں لطف آتا تھا۔ اور زیادہ تر وہ ایسی ہی تفریح کا عادی بھی تھا۔

راہ میں اور تو کوئی نہ ملا، صرف ایک جگہ ایک ٹیلے کے نیچے اسے تین چار جھونپڑیاں

کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ملیں، جہاں ایک بوڑھے آدمی کی غریبی سے متاثر ہو کر اس نے دس روپے کا ایک نوٹ اسے دے کر صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس علاقے میں پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ چٹرجی نے پوچھا بھی تو کہہ دیا، جب درد ٹھیک ہو گیا تو چلا آیا۔

اس دن رات کو پھر جب وہ چٹرجی کے پاس سے آ کر بستر پر لیٹا، اس کا دماغ دن بھر کے مختلف کاموں اور مختلف تاثرات کی وجہ سے وہ دن کے پچھلے واقعات سے کسی قدر خالی ہو چکا تھا اور وہ صبح کی بہ نسبت پر سکون تھا۔ اس لیے جلدی ہی سو گیا۔ آج دوسرے رضا کار بھی دن بھر کی دوڑ دھوپ اور محنت کے بعد تھک کر جلدی ہی سو گئے تھے۔ انھوں نے آج گرے ہوئے مکانوں کے ملبے صاف کرائے تھے۔ نئی جھونپڑیاں بنوانے میں مدد دی تھی اور دیہاتیوں کو اچھی اچھی باتیں بتائی تھیں۔ کچھ نے شوق کے مارے لکڑیاں کاٹی تھیں، کچھ نے زمین کھودی تھی اور روپ تو دن بھر جھونپڑیوں کے چھتوں پر کیلیں جڑتا رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیوں میں گٹے پڑ گئے تھے، کیونکہ اس قسم کی محنت اس نے زندگی میں پہلی بار کی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

آج پھر جب وہ صبح سو کر اٹھا تو بہت بے چین تھا۔ دیر تک تو وہ اسٹریچر سے نہیں اترا۔ اتفاق سے ہنگی ناتھ میس کی طرف جاتے ہوئے اندر گھس آیا، مگر خلافِ امید آج روپ نے اسے پھٹکارا نہیں، بلکہ بڑی نرمی سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سامنے پڑی ہوئی ٹوٹک وار (فولڈنگ) کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہنگی۔'' وہ بولا۔ ''اچھا اگر کوئی ایک ہی خواب کو مسلسل دوبارہ یا بار بار دیکھے تو؟''

اس کے لہجے میں سوال تھا۔

''میں نے تو سنا ہے ایسے خواب اکثر سچے ہوتے ہیں۔ کیوں، تم کیا دیکھ رہے

تھے؟'' ہنگی نے جواب کے ساتھ سوال بھی دے مارو۔

''تمہارا سر۔'' وہ بولا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں نے بھی یہی سنا تھا۔ لوگ یہی کہتے ہیں۔ کسی چیز کے کہنے کی کچھ تو بنیاد ہونی چاہیے ورنہ کہاوت وجود میں ہی کیوں آتی۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

''تم تو نرے خبطی ہو۔ جانے کیا کیا بک رہے ہو۔ ارے میرے بھیا وہاں ناشتہ چائے سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یہ اپنی منطقیں پھر دہرا لینا۔'' یہ کہہ کر ہنگی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا تم چلو، میں آیا۔'' روپ نے کہا۔

''میں چلا، تم آؤ۔'' ہنگی نے ویسا ہی جواب دے دیا اور باہر نکل کر یہ جا وہ جا۔

روپ اسی خیال میں کھویا ہوا سا اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسے بھی منہ ہاتھ بھی دھونا تھا۔ آج بھی اس نے بالکل وہی کل والا خواب دیکھا تھا اور اسی اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ اپنے پروفیسر کے اس مقولے کی یاد آوری کے ساتھ ساتھ کہ ہو سکتا ہے کہ مسلسل دیکھا جانے والا ایک ہی خواب کسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو، یا امریکی ہپناٹزم کی تھیوری کے مطابق کہ 'خیالات آپ اپنی کشش رکھتے ہیں' اس کا دل اندر سے بار بار کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے کسی طرف کھینچا جا رہا ہو۔ جیسے کوئی اسے یاد کر رہا ہو۔ اور خود اسے یاد آ رہا ہو۔

اسے فرائڈ کے ساتھی ڈاکٹر جوزف بریئر کا وہ قول بھی اچھی طرح یاد تھا کہ خواب شعور تحتی میں چھپے ہوئے مبہم یا غیر دانستہ تخیل کی تخلیق ہوتے ہیں۔ بہر حال اس خواب نے اس کے دماغ میں یہ خیال مستحکم سا کر دیا کہ وہ روح ضرور اس کے وجود سے کوئی گہرا لگاؤ رکھتی ہے۔ شاید اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور وہ۔ وہ ضرور اس کا انتظار کر رہی ہوگی، ورنہ وہ صرف اسی کے سامنے نہ آتی۔ صرف اسی کے خوابوں میں بار بار نہ دکھائی دیتی۔ ضرور وہ... اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ بھی تو اس لڑکی کی لاش کو دیکھ کر کتنا متاثر ہوا تھا جیسے اس کی کوئی آرزو مر گئی ہو۔ نہ جانے کیوں وہ اس کی موت پر اداسی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ نہ وہ اسے جانتا تھا، نہ اسے کبھی

Akram Allahabadi

دیکھا تھا نہ وہ زندہ تھی ۔اور یہ اسی نے اس لاش کے اٹھائے جانے کے وقت سرد آہ بھر کر حسرت سے کہا تھا کاش یہ زندہ ہوتی ۔ کہیں اس غیر شعوری حرفِ آرزو کو اس کی روح نے سن نہ لیا ہو اور وہ بھی اس سے متاثر ہو کر اس سے محبت کرنے لگی ہو۔

اور جیسے جیسے وہ سوچتا جاتا ، اس کے یہ خیالات تقویت پکڑتے جاتے ۔یہاں تک کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ آج اس کھنڈر میں ضرور جائے گا ، اکیلا۔

اور اگر وہ روح اس کا انتظار کرتی ہوئی وہاں مل گئی تو سمجھ لے گا کہ وہ ضرور محبت کرتی ہے اس سے اور پھر ساتھ میں وہ اپنے دل کو بھی ٹٹو لنے لگا ۔اور خواب والا اس روح کا بھرپور چاندنی میں نکھرا ہوا خوبصورت چہرہ اس کی آنکھوں میں آ کھڑا ہوا ۔اسے جھرجھری سی آ گئی ۔وہ محبوب ترین حسن ہے ۔اس کا دل بولنے لگا ۔اور جیسے اندر ہی اندر وہ اقرار کر رہا ہو کہ مجھے بھی اس سے لگاؤ ہے ۔مجھے بھی اس سے محبت ہے ۔محبت؟ ایک روح سے؟ نہیں یہ ایک جنون ہے ۔ایک پاگل پن ۔وہ جھنجلا کر دوبارہ کپڑے پہن کر میس کی طرف نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

آج پھر اس نے چٹر جی سے سر درد کا بہانہ کر دیا ۔چٹر جی کو معلوم تھا کہ کل اس کے سر میں درد رہ چکا ہے، ممکن ہے آج پھر ہو گیا ہو ۔وہ اسے گولیوں کے استعمال کی ہدایت کر کے رضا کاروں کے ساتھ چلا گیا ۔کیمپ کمانڈر نے خود روپ کو دو تین دن تک آرام کرنے کا مشورہ دیا اور اس نے عذر بھی نہ کیا۔

دو بجے تک کیمپ میں سوائے کیمپ آفس کے ایک کلرک اور محافظوں کے اور کوئی نہ رہا ۔روپ چاہتا نہ تھا کوئی اسے اس موت کے شہر کی طرف جاتے دیکھے جس کے بارے میں خود کیمپ میں بھی آسیبت کے چرچے سنے جاتے تھے۔

وہ نہ جانے کیوں اپنے اس گمان کی تحقیق کرنا چاہتا تھا اس مسلسل خواب کا تعلق

Akram Allahabadi

ضرور کسی حقیقت سے ہے۔ اسے ایک طرح کا یقین سا تھا کہ وہ اس لڑکی کی روح اس بار موت کے شہر کے اس ویران کھنڈر میں جیسے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ ایک لاشعوری کشش اسے بے طرح اس انجانی منزل کی طرف کھینچ رہی تھی۔ جہاں نہ جانے ایک زندگی کون سی کروٹ بدلے۔

دوپہر کا سورج بیچ آسمان پر چمکنے لگا۔ زرد زرد دھوپ پگھلے ہوئے سونے کی طرح حدِ نظر تک زمین سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ناہموار زمین کو تنگ اور لمبے قدموں سے ناپتا، اونچے ٹیلوں کو عبور کرتا، گرے درختوں کو پار کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس وقت گرم سرج کی پتلون اور اس کے اندر ٹھسی ہوئی سفید قمیض پر کتھئی رنگ کا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ سر ننگا تھا اور پیروں میں فلکس کے ہلکے جوتے تھے جن کی ٹو پر بار بار راہ میں پڑے ہوئے پتھروں کی ٹھوکر سے ہلکی ہلکی چتلیاں پڑتی جاتی تھیں۔ اس کا گندمی رنگ دھوپ میں اور صاف ہو گیا تھا، لیکن ہلکے جاڑوں میں بھی دوپہر کا سورج پسینہ نکال دیتا ہے۔ اس کے ماتھے پر بھی پسینے کی بوندیں بار بار ابھر آتیں جنھیں وہ سفید رومال سے پونچھتا جاتا۔ گرمی زیادہ معلوم ہوئی تو اس نے سوئٹر اتار کر کندھے پر ڈال لیا۔ اب وہ اس درکی ہوئی سڑک کی دڑاروں کو عبور کر کے جہاں پچھلی بار ان کا ٹرک رک گیا تھا، ایک خشک اور نیچے سے پھٹی ہوئی زمین والے نالے کو پار کرنے کے بعد ان بھیانک سرحدوں میں داخل ہو گیا جہاں وسعتِ نگاہ تک وہ ویران موت کا شہر اپنے شکستہ آثار بکھیرے پڑا ہوا تھا۔ دوپہر کے اس سناٹے میں ایک ایسی جگہ جہاں ہزاروں بے گور و کفن موتیں ہو چکی ہوں اور کسی ذی روح کا پتا نہ ہو یقیناً آپ سے آپ دہشتناک معلوم ہوتی تھی۔ آج اگر اس پر ایک لامتناہی جنون سوار نہ ہوتا تو شاید اکیلے وہ اس جگہ قدم رکھتے ہوئے کانپ اٹھتا۔ لیکن وہ اس دھن میں کھویا ہوا زمین کے شگافوں اور بیچ بیچ حائل ہوتے ہوئے کھنڈرات کو پھلانگتا کچلتا چلتا رہا۔

دستی گھڑی کی سوئیاں آگے گھوم کر ساڑھے ۱۲ پر پہنچ گئیں۔ اس نے ایک بار چاروں

Akram Allahabadi

طرف نگاہ دوڑائی ۔دور کہیں نشیب کی طرف ایک کھنڈر سے کوئی آوارہ کتا نکل کر بھاگ رہا تھا۔ وہ بھی ...وہ بھی کسی کی روح نہ ہو۔آوارہ روحیں اکثر دوپہر کے سناٹوں میں ویران مقامات پر گھوما کرتی ہیں طرح طرح کی شکلوں میں ۔اسے خفیف سی جھرجھری آگئی ۔اسی طرح چلتے چلتے وہ اس ٹیلے پر جا پہنچا جہاں اس کی منزلِ مقصود تھی ۔بنگلہ نما ویران کھنڈر سامنے کھڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور زمین پر لیٹے ہوئے برگد کے بوڑھے درخت کے پاس وہ زمین میں دھنسی ہوئی چٹان جیسے اسے دور سے بلا رہی تھی ۔بالکل اس خواب کا سا عالم ۔فرق صرف اتنا تھا کہ آسمان پر پورے چاند کی جگہ گول سورج چمک رہا تھا اور فضاؤں میں ٹھنڈک کی جگہ تمازت تھی ۔شمال مغرب میں کھڑی ہوئی خاموش پہاڑیوں کی طرف سے تازہ ہوا کے آوارہ جھونکے سنسناتے ہوئے آئے اور اسے چھوتے ہوئے گزر گئے ۔اس کے کانوں سے جیسے دور دور بہت دور کی ایک لاہوتی موسیقی کی مدھم مدھم لہریں ٹکرانے لگی ۔لیکن جب اس نے سر کو جھٹکا تو فضا مرے ہوئے آدمی کی طرح خاموش تھی ۔کچھ دیر وہ وہیں اس چٹان پر بیٹھا جیسے اپنے خواب کے مناظر کے تسلسل کو آزماتا رہا ،لیکن نہ کوئی آیا ،نہ کوئی بات ہوئی ۔اسے ایک بار اپنی حماقت پر کھسیانی سی ہنسی آگئی ۔خواب خواب ہی تھا ۔عالمِ بیداری سے اس کا کیا رشتہ ۔اس کے دل نے خود ہی اس کے دماغ کی تردید کی ،مگر وہ دبی سی ہوک جو دل کے کسی گوشے میں ایک نامعلوم اور غیر شعوری طور پر جا چھپی تھی آخر وہ کیوں ۔وہ کیوں یہ چاہتا تھا کہ اس سفید آنچل لہرائی ہوئی لاہوتی تصویر کو اپنی آنکھوں سے ان کھنڈروں میں متحرک دیکھے ۔وہ پہلے تو اسے دیکھ کر ہی خوف سے بھاگ اٹھا تھا ۔پھر اسی کی آرزو کیوں جو ناممکنات سے ہو ،جس کا وجود ہی نہ ہو ۔ہو تو اتنا بھیانک کہ صرف ایک روح ،ایک ہوا ۔مگر یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔جیسے قدموں نے ضد کر رکھی ہو اور دل تھالی کے بینگن کی طرح دائرے کے دونوں سروں پر لڑھک رہا ہو ۔ایک دائرہ جو مقید کر لے اور جسے توڑے بغیر فرار ممکن ہو ۔اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دور گوہاٹی کے بھی اس پار کسی قبائل مرگھٹ میں خبیث دیوتاؤں کی روحوں کے رقص پر

Akram Allahabadi

بھاری ڈرم بج رہے ہوں۔ ہوا کے سناٹے کا انتشار کانوں کے پردوں پر ایسی ہی ضربیں لگا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر پھینکی اور اونچے ٹیلے سے نشیب کی طرف پھیلتی چلی گئیں۔ ویرانیاں ایک لامتناہی شکستہ مقبروں کے سلسلے کی طرح اداس خاموش اور اس قدر پرسکون پڑی تھیں کہ دور کسی کھنڈر سے سیر ہو کر اچانک اڑنے والے گدھ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ اس پر ایک لمحے کے لیے سنسنی سی طاری ہو گئی۔ لیکن وہ سوچتا ہوا کہ مردوں کی بستی میں سب سوئے ہی تو رہتے ہیں، ورانڈے کو عبور کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

کسی روح کی موجودگی کا تخیل وقتی طور پر اس کے احساسات سے زائل ہو چکا تھا، لیکن ایک بار پھر وہ سکتے میں رہ گیا۔ کوئی چیز کھنڈر سے دوڑ کر نکلی اور اس کے قریب سے کسی قدر بچتی ہوئی گزر کر دوسری طرف چلی گئی۔ وہی زرد اور چمکیلی آنکھوں والی سیاہ بلی۔ کیا وہ وہی تو نہیں۔ لیکن نہیں وہ صرف ایک کالی بلی ہی ہوگی۔ اس نے اس دن ایک چوہا بھی تو دیکھا تھا یہاں۔ چوہا اور بلی۔ بلی اور چوہا۔ یہ کوئی عجیب بات نہ ہوئی۔ کھنڈر کے کسی کونے میں دبی رہ گئی اجناس کو کھانے چوہے آتے ہوں گے اور چوہوں کو کھانے کے لیے بلی۔ لیکن وہ سفید کیوں نہیں۔ وہ کسی اور رنگ کی کیوں نہ ہوئی۔ وہ خاص طور پر آوارہ روحوں کے بدلے ہوئے بھیس کی طرح کالی اور بھیانک کیوں ہے۔ اس کی زرد آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے۔ سر جھکائے وہ یہی سوچتا ہوا اندر ے چھوٹے شکستہ کمرے کے قریب سے گزر کر دالان کے اس حصے میں پہنچ گیا، جہاں اوپری چھت کا ایک باقی رہا کونا ایک کھمبے پر لٹکا کھڑا تھا اور کھمبے کی جڑ سے دور تک پھیلا ہوا ملبے کا ڈھیر تھا۔ ٹھیک وہیں۔ اس نے سرسری طور پر نظریں اٹھائیں۔ ایک طرف سے دیکھنا شروع کیا اور پھر اچانک اس کا سارا جسم لرز گیا، رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اس سے صرف چند قدم دور سامنے موجود تھی، اس ستون کے سہارے ٹکی کھڑی تھی۔ باریک بالکل سفید سی چادر نما شے میں لپٹی ہوئی وہی روح۔ ان سفید سے پردوں میں اس کا سفید سا گول خوبصورت چہرہ

Akram Allahabadi

اوراس پر گھنیری پلکوں والی وہ نکھری ہوئی خوبصورت آنکھیں اس قدر پرکشش تھیں کہ اسے اپنا خواب پوری طرح یاد آ گیا۔ بالکل وہی۔ ویسے ہی۔ اس روح کے نازک سے گلگوں لبوں پر ایک خوبصورت تبسم تھا۔ تبسم جو دل کی دھڑکنیں چرا لیتا ہے۔ وہ ایک پہلو سے ستون پر کسی قدر جھکی ہوئی ایک عجیب ادائے محبوبانہ سے کھڑی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ کاش وہ کوئی زندہ شے ہوتی تو وہ پاگلوں کی طرح اس سے دوڑ کر لپٹ جاتا۔ وہ روپ جسے عورت کے ہر روپ سے تقریباً نفرت سی ہو گئی تھی۔ جو کلکتہ یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکیوں سے لے کر اپنے خاندان کی ایک ایک لڑکی سے متنفر سا رہتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ نفسیات کے خشک فلسفے نے اس کی زندگی سے رومانی وابستگیاں چھین لی تھیں یا اس کے مشاہدے میں عورت کو محض ایک جنسی ہمعصر، ایک غیر اہم اور عام وجود کے علاوہ ایک غیر مستقل اور غیر وفادار اور نفسیاتی اعتبار سے جذبات کی فراوانی پر جگہ جگہ لغزش کی جانے والی ہستی کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس نے بہت سی داستانیں سنی تھیں۔ بہت سے واقعات دیکھے تھے۔ عورت کی کم ظرفیوں، بیوفائیوں کے، اس کی ہلاکت آفرینیوں اور خودستائیوں کے۔ اور وہ اسی لیے اس سماجی بندھن سے بھی دور بھاگتا رہا جسے دواہ اور شادی کا نام دے کر ایک مرد کو پابند کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عورت کو اپنی زندگی کا آدھا حصہ دے دے۔ خواہ وہ اپنی زندگی کا بہت کچھ کہیں اور دے چکی ہو۔ یا وہ اس مرد کو اپنی مفت ملی جاگیر سمجھے۔ بنگالی گھرانوں میں عورتوں کی آزادی کی وہ کچھ ایسی ہی شکلیں دیکھ چکا تھا اور خاص کر اس کی زندگی کے اہم واقعے نے اس کے احساسات میں اور زیادہ تلخیاں بھر دی تھیں جب یونیورسٹی میں ڈاکٹر دین دیال کی لڑکی اوشا نے اس کے ساتھ پاگل پن کی حد تک اپنی محبت جتا کر بعد میں آنے والے ایک نوجوان پروفیسر سے صرف اس لیے عشق کر لیا تھا کہ وہ پروفیسر بھی تھا اور زیادہ خوبصورت بھی۔ اس واقعے نے اسے عورت اور اس کی محبت کا نہ صرف منکر بلکہ دشمن سا بنا دیا تھا اور اسی لیے وہ نیلا کی طرف سے بھی ہمیشہ بے رخی اور چڑ چڑا پن برتتا رہا۔ اسے نیلا سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ وہ اس سے اس قدر قریب تھی کہ محبت نہ سہی،

جوانی کے احساسات تو اس آنچ سے بھڑک ہی سکتے تھے۔چٹرجی اسی لیے اسے کبھی کبھی چھیڑنے کو برہمچاری بھی کہہ ڈالتا تھا۔اور وہی برہمچاری صرف تین دن کے عجیب وغریب واقعاتی تسلسل میں اس قدر تبدیل ہوگیا تھا جیسے اس کے سینے سے اس کا حساس دل کسی نے نکال لیا ہو۔وہ اس کی دنیا کی زندہ عورت نہ تھی۔عالمِ لاہوت سے آئی ہوئی ایک پاکیزہ روح تھی۔ ایک ہوا پہاڑوں کے دامن میں وسیع میدانوں پر سے بہتی ہوئی وہ ہوا جو گندگی کو بھی پاکیزہ کر دیتی ہے۔اس حسین ترین پاکیزگی کے تاثر سے ڈوبے ہوئے خلا میں شاید وہ اپنی زندگی کے خاموش اندھیروں کو اجاگر کرنے کے لیے روشنی کی ایک کرن ڈھونڈنا چاہتا تھا۔وہ ان کی گہرائیوں میں اپنے ماضی کی تمام تلخیاں دفن کر دینا چاہتا تھا۔لیکن کئی گھنٹوں سے وہ صرف سوچتا رہا تھا اور جب وہ مردہ لڑکی کی خوبصورت روح اس کے سامنے متحرک اور مسکراتی کھڑی تھی۔ اس کے مافوق الفطرت اور لاہوتی وجود کے احساس نے روپ کی ساری ہمت کافور کر دی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے صرف دیکھتا رہ گیا۔اس سے قدم نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔

"یہ ویران کھنڈر۔یہ موت کا شہر۔یہ آوارہ روح۔اف وہ کہاں آپھنسا۔"

ایک طویل جھرجھری کے ساتھ اس کی آنکھیں بھنچ گئیں۔لیکن وہ صرف مسکراتی رہی اسی ستون سے ٹکی ہوئی۔چند سیکنڈ کے بعد روپ کے ذہن پر وحشت کی گرفت جب کچھ ڈھیلی ہوئی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔مگر وہ اب بھی موجود تھی۔یہ اس کا واہمہ تھا نہ خواب۔روپ کی کانپتی ہوئی انگلی اس کی طرف اٹھی اور اس کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"کیا تم...تم کیا...میرا ہی انتظار کر رہی تھیں؟" اس نے اپنے مسلسل خوابوں سے اخذ کردہ نتائج سے متاثر لہجے میں پوچھا۔

لیکن وہ خاموشی سے صرف اسے دیکھتی رہی۔اور وہ جواب نہ پا کر تذبذب میں پڑ گیا۔البتہ اس روح کی معصوم سی مسکراہٹ نے اس کے خوف وجھجک میں کچھ کمی کر دی۔

"تم یقیناً تم اس لڑکی کی روح ہو مگر...مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" اس نے ہمت کر

Akram Allahabadi

کے دوسرا سوال کیا۔اور وہ اب بھی خاموش تھی۔

تم نے مجھے آواز دی تھی کل اسی جگہ خواب میں تم میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں... میں کل سے بہت بے چین رہا ہوں۔'' وہ جیسا سے دو راتوں کے خواب یاد دلانے لگا، لیکن اب کی بار اس کے چہرے سے مایوسی کا پھیکا پن دوڑ گیا۔ اسے خیال آیا کہ روحیں شاید بول نہیں سکتیں اور بول سکتی ہیں تو شاید زندہ لوگ ان کی آواز نہیں سن سکتے۔ اسے کچھ عجیب سی بے بسی محسوس ہوئی، جیسے یہ کوئی اچھی بات نہ ہو۔ وہ اور منتشر سا ہو گیا۔

''شاید تم... تم بول نہیں سکتیں، شاید روحیں بولا نہیں کرتیں۔ مگر میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تم... تم میری زندگی میں ہیجان کیوں پیدا کر رہی ہو۔''

''تم میرے خوابوں میں کیوں آ رہی ہو۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم میری زندگی سے نہ کھیلو۔ مجھے اس دنیا میں بہت کم خوشیاں نصیب ہوئی ہیں۔ کیا تم اپنی روحوں کی دنیا کو واپس نہیں جا سکتیں۔'' وہ اٹک اٹک کر کہنے لگا۔

اس کے لہجے میں مایوسی، انتشار اور التجا کی آمیزش تھی۔ جیسے وہ روح اسے یاد آ کر اس کے خوابوں میں اور اس کے سامنے آ کر اس پر کوئی ظلم کر رہی ہو۔

اور اس پر بھی وہ صرف خاموشی سے مسکرا دی تو وہ پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا۔

''کچھ بول نہیں سکتیں تو کیا تم کچھ سن بھی نہیں سکتیں؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں؟'' وہ کانپنے لگا تھا۔ جیسے اس کی گفتگو کا ردِ عمل خود اسی پر ہو رہا ہو۔

''تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔' اس کی کھنکتی ہوئی آواز اچانک سنائی دی۔

سامنے پڑے ہوئے پتھروں کی طرف اشارہ کر کے اپنی خوبصورت پلکیں جھپکا کر وہ بڑے نرم لہجے میں ایک دم بول پڑی تھی۔ اور مسرت کی ایک سرخ لہر نے روپ کے چہرے کی کیفیت بدل دی۔ حیرت کے ساتھ وہ اس تاثر کو بھی نہ چھپا سکا جو اس روح کے بول پڑنے

Akram Allahabadi

سے اس پر طاری ہوا تھا۔

وہ کسی قدر ڈرتے، جھجکتے اس روح سے پانچ قدم دور ملبے کے اس طرف پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور وہ روح خود بھی اسی ستون کی جڑ سے ٹیک لگا کر اس جگہ بیٹھ گئی جہاں کھڑی ہوئی تھی۔

"تو تم مجھے پہچان گئے۔" وہ دوبارہ ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ہاں، ورانڈے کے ملبے کے نیچے سے میں نے اور میرے ساتھیوں نے ہی تمھیں، میرا مطلب ہے کہ تمہارے جسم کو نکال کر چتا میں جلایا تھا۔" دبی ہوئی سی آواز میں روپ نے جواب دیا۔

"اور تم نے مجھے چتا کے قریب دیکھ بھی لیا تھا۔" روح نے اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تم اپنے جلتے ہوئے جسم کے پاس ہی دھوئیں سے ابھری تھیں۔ میں نے دیکھا تھا، مگر مجھے دیکھتے ہی تم اس دھوئیں میں تحلیل ہو گئیں۔" وہ بتانے لگا۔

"اور پھر؟" اس نے ایک خاص انداز سے سر کو ایک طرف جھٹک کر پوچھا۔ اس کے لمبے چمکدار ریشمیں بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر آ گئی تھی۔

"پھر میں نے تمھیں یہیں اس کھنڈر میں اس روز دیکھا۔" روپ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔

"اس روز تو تم مجھ سے ڈر کر بری طرح بھاگے تھے۔" وہ ہنس پڑی اور اس کے باریک باریک موتیوں جیسے دانت گلابی ہونٹوں کے بیچ چمک اٹھے۔

"مجھے اب بھی تم سے ڈر لگتا ہے۔" روپ کا جواب سنجیدہ تھا۔

"تو پھر تم کیوں یہاں آئے ہو؟" اس روح نے معصومیت سے سوال کیا۔

"کیونکہ دو دن سے روز تم مجھے خواب میں اسی مقام پر بلاتی رہی ہو۔ میں مجبور تھا۔

Akram Allahabadi

میں نہیں جانتا کیوں، لیکن تم سے ڈرتے ہوئے بھی میرا دل جیسے تمہاری طرف کھنچتا رہا ہے۔" روپ بولا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" وہ عجیب سا سوال پوچھ بیٹھی۔

"محبت؟ نہیں۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"کیوں؟" روح نے اپنی خوبصورت آنکھیں مچکا کر پوچھا۔

"ان زندہ انسانوں میں کوئی اس قابل نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے ماں باپ؟" روح نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ خون کا رشتہ ہے۔"

"تمہارے دوست؟"

"وہ خلوص کا سودا ہے۔"

"کوئی عورت؟"

"نہیں۔ مجھے عورت کے نام سے نفرت ہے۔ عورت گرگٹ کی اولاد ہے۔ رنگ بدلتے رہنا اس کی فطرت ہے۔" روپ نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا، لیکن لہجہ نرم تھا۔

"اور میں؟" وہ اچانک اپنے بارے میں پوچھ بیٹھی۔

"تم؟ تو تو ایک روح ہو۔ نکھری ہوئی چاندنی کی طرح پاکیزہ، فرشتگی کی طرح معصوم۔" اس نے غیر ارادی طور پر جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس روح سے بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔

"اب تم مجھ سے نہیں ڈر رہے؟"

"اب؟ نہیں۔ لیکن سوچتا ہوں تم مجھے کسی وقت ڈرا سکتی ہو۔"

"کیوں؟"

"روح جو ٹھہریں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

Akram Allahabadi

"تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔تمہارا نام روپ ہے؟" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں پوچھا۔اس کی آواز میں ایک نقرئی کھنکار اور کہیں سونی چراگاہوں میں بجتی ہوئی کسی گڈریے کی بنسری کا سریلا پن تھا۔مگر وہ اس سوال پر چونک سا پڑا۔

"روپ؟ کیا تم میرا نام بھی جانتی ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"روحیں سب کچھ جانتی ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"اوہ، میں بھول گیا تھا کہ روحیں عالمِ ارواح سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کے لیے کچھ ناممکن نہیں ہے۔" روپ نے جواب دیا۔

"ایسا تو نہیں، وہ بھی چند باتوں کے لیے پابند ہیں۔"

"کیا موت کے بعد روحوں کا حسن اور نکھر آتا ہے؟" روپ نے اچانک سوال کیا۔

"ایسا کیوں؟" روح ہنستی نظروں سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"تم اپنی لاش سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہو۔اور میں... میں تو اسی سے متاثر ہو گیا تھا۔مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ تم مر کیوں گئیں۔"

"نہ مرتی تو؟" اس نے بڑے دلکش انداز سے کسی قدر آگے کی طرف جھک کر سوال کیا۔

"شاید میں اپنی زندگی تمہارے سپرد کر دیتا۔" وہ جذبات کی رو میں کہہ گیا، لیکن اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ اس سے طریقے کی باتیں نہیں کر رہا ہے۔اس وقت وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔روپ کو شک گزرا کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گئی ہے۔وہ پوچھ بیٹھا۔

"میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی جو تمہیں ناگوار گزری ہو۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"شاید نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"مرنے سے پہلے تمہارا نام کیا تھا؟" روپ نے سوال کیا۔

''اوشا۔'' وہ مختصراً بولی۔

''کیا ہم پھر بھی مل سکیں گے؟'' روپ نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ سلسلہ صرف آج تک ہی محدود نہ رہ جائے۔ اتنی دیر کی گفتگو کے بعد اسے کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس روح سے گہری دلچسپی ہوگئی تھی۔

''ممکن ہے۔'' وہ بولی۔ ''روز دوپہر کو ان ویرانوں میں سیر کرتے آتی ہوں اور خاص کر یہاں، لیکن...'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''لیکن کیا؟'' روپ نے بیقراری سے پوچھا۔

''مجھ تک آنے کے لیے تمہیں دو شرطوں کا خیال رکھنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ اور روپ سوالیہ انداز میں کھڑے ہوکر اس کی صورت تکنے لگا۔

''کبھی میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' وہ بولی۔

''میری یہ جرأت نہ ہوگی۔'' روپ نے یقین دلایا۔

''اگر کبھی کسی دن تمہارے سوا کسی اور شخص نے مجھے دیکھنے کی کوشش کی یا دیکھ لیا تو اس دن سے ہم بھی کبھی نہ مل سکیں گے۔ وہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔''

''روحوں کی آزادی بہت محدود ہوتی ہے۔'' اس نے مسکرا کر جملہ ختم کیا۔

''میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔'' روپ نے وعدہ کیا۔

اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص محبوبانہ انداز سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دالان کے دوسرے طرف والے بڑے شکستہ کمرے سے گزر کر پچھلی دیوار کے اس شگاف میں غائب ہوگئی جس کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ دوپہر کی سنسناتی ہوا کا ایک تیز جھونکا اسی شگاف سے سیٹی بجاتا ہوا گزرا اور پھر ہر طرف وہی موت کا سا سکوت طاری ہوگیا۔

روپ کا وہ پہلا سا ڈر اور اس کے لیے اس بھیانک ماحول کی پہلے جیسی لرزانے والی آسیبیت اب قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ یہ ایک عجیب سی خطرناک تبدیلی اس میں پیدا ہوئی تھی

Akram Allahabadi

کہ وہ ایک مردہ لڑکی کی روح کے اس قدر نزدیک پہنچ گیا تھا۔

آج کھنڈر سے لوٹتے وقت وہ خوش خوش تھا۔ راستے میں آج کے محیرالعقل واقعات کے تصوراتی تسلسل میں اس کے قدم بہک بہک پڑتے رہے، لیکن وہ اپنے خیالات میں اتنا منہمک تھا کہ اسے یہ خبر نہ ہوئی کہ وہ اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے اب اپنے کیمپ میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ چانک پڑا جب اس کو کیمپ کے گشتی فوجی چوکیدار نے ٹوکا۔ "کدھر گئے تھے، بنگالی بابو؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

"کہیں نہیں۔ ذرا یونہی ٹہلنے چلا گیا تھا۔" اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"دھوپ بہت کڑی ہے۔ ایسے میں اس طرح نہ گھومنا چاہیے۔" معمر چوکیدار نے نصیحت کی۔ اور وہ بغیر کچھ جواب دیے اپنے خیمے میں چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

چٹرجی کو جیسے اسی کے سر درد کی فکر تھی۔ ۶ بجے کی ڈیوٹی سے واپس ہوتے ہی کپڑے بدل کر وہ سیدھا روپ کے خیمے میں گھس گیا۔ روپ اس وقت اسٹریچر پر لیٹا تھا۔

"روپ۔" اس نے آواز دی، لیکن شاید وہ سو رہا تھا۔ چٹرجی نے سرہانے جا کر پہلے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، نارمل ٹمپریچر معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے نتھنوں پر انگلیاں لگا کر دیکھا۔ سانس بھی گرم نہ تھی۔ لیکن ابھی اس نے ہاتھ ہٹایا بھی نہ تھا کہ روپ نے کروٹ بدلی، آنکھ کھول دی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

چٹرجی بھی مسکرا دیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے، بلکہ ٹھیک سے بھی عمدہ ہے۔" روپ مسکراہٹ کے ساتھ جماہی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"ایسی کیا بات ہے، بھئی۔ آج تو بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔" چٹرجی نے کہا۔ "کوئی دوسرا عمدہ خواب تو نہیں دیکھ ڈالا؟"

"خواب؟ ہونہہ۔ تم سمجھتے تھے وہ خواب صرف خواب ہی تھا۔" اس نے کہا۔

"نہیں تو پھر؟" چٹرجی کا سوال حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"دوست، میرا خیال بالکل غلط نہیں تھا۔ آج وہ سچ مچ میرا انتظار کر رہی تھی۔"

"اسی جگہ، اسی کھنڈر میں۔" روپ نے اسے اس طرح بتایا جیسے اسے خود اس پر حیرت نہ ہو۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔" چٹرجی سنجیدہ ہو گیا۔

"میں تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا، چٹرجی۔" روپ نے دہرایا۔

"تو کیا تم وہاں گئے تھے؟" چٹرجی نے مزید حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔ اور وہ مجھے ملی۔" روپ نے چٹرجی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہ ہذیان کب سے بکنے لگے ہو، بھلا روح نظر بھی آتی ہے کہیں۔" چٹرجی نے پھر یقین نہ کرتے ہوئے تکرار کی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم یقین نہ کرو گے۔" روپ نے پوری سنجیدگی سے اپنے الفاظ دہرائے۔

"کوئی بات بھی ہو۔ ایک مردہ لڑکی کی روح کو آپ نے اس کی چتا پر دیکھا، پھر وہ کھنڈر میں ملی، پھر خواب میں آئی، پھر آپ سے دن میں ملاقات ہوئی۔ یہ ایک بیمار دماغ کی تصور پسندیوں کا سلسلہ نہیں تو اور کیا ہے۔"

چٹرجی نے بزرگوں کی طرح اسے کسی قدر ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"خیر جاؤ، میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔" روپ روٹھ سا گیا۔

Akram Allahabadi

"اچھا، بتاؤ کیسے ملی؟ کیا ہوا؟" چٹرجی اس کی ناخوشگواری کو محسوس کر کے اس کی تسکین کے لیے اس یقین میں نہ آنے والے قصے کو سننے لگا۔

روپ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ساتھ ہی اس نے دو تین بار اس روح کا وہ جملہ دہرایا کہ اگر ہمیں کسی اور نے دیکھ لیا تو پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس روح سے ملنے کے لیے مجبور ہے۔ وہ اس کی زندگی ہے۔ یکایک اس قدر قریب ہو گئی کہ وہ اسے نہ دل سے دور کر سکتا ہے نہ خیالوں سے۔ اور دراصل روپ نے چٹرجی کو اس لیے سب کچھ بتا کر اس روح کا کہا ہوا وہ جملہ دو تین بار دہرایا تھا کہ چٹرجی اگر کبھی اس پر شک کر کے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش بھی کرنا چاہتا ہو تو ایسا نہ کرے، کیونکہ اس طرح وہ اس روح سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ کر اداسیوں میں گم ہو جائے گا۔ اور اسے یقین تھا کہ چٹرجی جیسا وفادار دوست اور مونس حالات کی اس نزاکت کا لحاظ ضرور رکھے گا۔ پھر بھی اس نے چٹرجی سے وعدہ لیا کہ وہ اس بارے میں کسی سے کبھی ایک لفظ نہ کہے گا۔

چٹرجی نے وعدہ تو کر لیا، لیکن روپ کی آج کی باتیں سرے سے اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے وہ پھر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ ساری آسیبیت تمہارے دل میں بیٹھے ہوئے کسی بہت گہرے وہم کی شدت پسندی کا نتیجہ ہے، روپ۔"

"لعنت ہو تم پر چٹرجی۔ جو مجھ اچھے خاصے کو پاگل سمجھنا چاہتے ہو۔" روپ نے جلے بھنے الفاظ میں کہا۔ چٹرجی نے پھر لہجہ بدل دیا۔ وہ بولا۔

"میرے بھائی تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ تم جو کچھ کہو اس پر یقین ہی کر لیا جائے خواہ وہ بالکل ہی بعید از عقل بات کیوں نہ ہو۔ میں نے تمہیں پاگل تو نہیں گردانا۔ میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ تم بری طرح اس اتفاقی حادثے سے متاثر ہو کر ایک شدید وہم کا شکار ہو گئے ہو۔"

"اچھا یہ بحث چھوڑو۔ لیکن یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔" روپ نے اپنی ترش گوئی کو

Akram Allahabadi

محسوس کر کے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"میں کیوں کہنے لگا۔ اچھا اب چلو۔ تھوڑی دیر باہر تفریح کریں گے چائے وغیرہ پئیں گے۔ ذرا طبیعت بہلے گی۔"

چٹر جی نے موڈ بدل کر ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روپ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑے بدل کر اس کے ساتھ ہو گیا۔

باہر بوس اور ہنگلی ناتھ میں کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے تقریباً ۱۰ قدم کے فاصلے پر کھڑے گاؤں کی بہوؤں کی طرح دور ہی سے چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ اور فوجی رضا کار اپنے کینٹین کے پاس کھڑے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"یہ کیا بیہودگی لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے کہ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس ہیں یا چمار پورے کے شرابی۔" چٹر جی نے دونوں کو جھاڑا۔

"دیکھو تو میری ماں نے مجھے حلوا باندھ کر دیا تھا۔ یہ بوس میرے خیمے میں گھس کر سب چٹ کر گیا۔" ہنگلی ناتھ نے چٹر جی کو ثالث بناتے ہوئے اپنا مقدمہ پیش کیا۔

"چٹ کر گیا ہوگا تیرا باپ، میں کیا گھر کا بھوکا ہوں بے گدھے۔" بوس پھر بھڑک اٹھا۔

"او خربوز کے بیجے، میرا باپ کیا پرلوک سے حلوا کھانے آ گیا میرا۔ ایک تو کھاؤ اوپر سے غراؤ۔" ہنگلی ناتھ نے دو بیچ بچاؤ کرانے والوں کی موجودگی سے شیر ہو کر آستینیں چڑھا لیں۔

بوس روپ سے بولا۔ "دیکھا سالے کا اوچھا پن۔ چھٹانک بھر حلوے کے لیے کیا ٹینی مرغے کی طرح اکڑ اکڑ کر لڑ رہا ہے۔"

"اہاہاہا... جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اسے حلوے کا وزن بھی معلوم تھا۔" ہنگلی ناتھ کو ثبوت مل گیا۔ "اور پھر اس نے کھایا ہی تھا تو میرے لیے بھی تھوڑا چھوڑ دیا ہوتا۔"

سمجھوتے والے انداز میں اس نے اپنی جگہ نرم ہو کر کہا۔

"چلو خیر، کسی نے بھی کھایا، حلوے کی قدر ہو گئی۔" روپ نے ہنس کر کہا۔

"ہوں، قدر ہو گئی۔ ارے اگر یہ مجھ سے مانگ لیتا تو کیا میں نہ دیتا۔" ہنگلی ناتھ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اچھا لے، اب سیدھے سے رونے لگا تو لے کھا۔ کتنا حلوا کھاتا ہے۔" یہ کہہ کر بوس نے اپنے ڈھیلے کرتے کی دونوں جیبوں سے کاغذ کی دو بڑی بڑی پڑیاں نکال کر ہنگلی ناتھ کی طرف بڑھا دیں۔ ہنگلی ناتھ نے انھیں لے لیا۔ کھول کر جو دیکھا تو اس میں پتھر اور مٹی کے ٹکڑے تھے۔ وہ وہی پتھر کھینچ کھسیاتا ہوا بوس کے پیچھے دوڑا۔

بوس ہنستا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ سب قہقہے لگا کر ہنس پڑے اور سامنے کے کیمپ سے کمانڈر کو آتے دیکھ کر ہنگلی ناتھ کے پتھر چھینکنے پڑے۔

"ہیلو روپ، کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" میجر فرہاد نے رک کر بھاری مگر مشفقانہ آواز میں پوچھا۔

"جی اس وقت تو درد بہت خفیف ہے۔" روپ نے مؤدب طریقے پر جواب دیا۔

"ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تبدیلیِ آب و ہوا کا اثر ہے۔ بہر حال تکلیف بڑھے تو مجھے خبر دینا۔" میجر فرہاد نے بزرگانہ مشورے کے طور پر کہا۔

"بہت خوب۔" روپ نے جواب دیا اور میجر ادھر ادھر کھڑے ہوئے فوجی رضا کاروں کے سلام کا جواب اشارے سے دیتا ہوا آگے چلا گیا۔

"یہ ہنگلی ناتھ اور بوس کی جوڑی بھی خوب ہے۔ کمبخت جہاں اکٹھے ہوتے ہیں لڑتے ضرور ہیں۔" روپ نے کہا۔

"ان کی وجہ سے تو کیمپ میں اتنی رونق رہتی ہے۔ کام پر بھی اسی طرح سب کو ہنساتے رہتے ہیں۔" کھڑجی بولا۔

Akram Allahabadi

''کل چلو گے نا کام پر؟''اس نے روپ سے پوچھا۔

''میجر کا کہنا ہے دو تین دن آرام کرو۔''روپ نے جواب دیا۔

''آرام کرو، لیکن اس موت کے شہر کی طرف نہ چلے جانا۔''ہنس کر چٹرجی نے کہا اور روپ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''آؤ کینٹین میں چائے پئیں گے۔''چٹرجی اسے ساتھ لے کر کینٹین میں چلا گیا۔ یہاں ان کے بعض دوسرے ساتھی بھی موجود تھے۔ یکجا ہو کر ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

آج رات روپ اطمینان اور مسرت کی نیند سویا۔ البتہ سونے سے پہلے جب وہ خیمے کے باہر نکھری ہوئی چاندنی میں ٹہل رہا تھا اسے وہ خواب جو اب حقیقت میں تبدیل ہو چکے تھے بار بار یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش اس وقت ایسے میں وہ اس کھنڈر میں پہنچ جائے اور وہ اس کی راہ دیکھتی ہو، لیکن کیمپ ٹیلے پر پہنچ کر موت کے شہر کی طرف نظر ڈالنے سے اسے لرزہ آ گیا۔ رات کے سناٹے میں اس کا بھیانک پن ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ جاتا تھا، کیونکہ سب ہی ذہنوں ان زندہ دفن ہو جانے والے ہزاروں انسانوں کی اس ویران بستی کا تخیل بہرحال شہرِ خموشاں کی طرح موجود تھا۔

بستر پر لیٹ کر وہ چند ہی کروٹوں میں سو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو ۸ بجے تھے اور سرہانے بوس کھڑا اسے جگا رہا تھا۔

''چلو ناشتہ تو کر لو، چٹرجی بلا رہا ہے، سب انتظار کر رہے ہیں۔''وہ بولا۔

''تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔''روپ نے یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیا اور خود لیٹرین کی طرف چلا گیا۔

۱۰ بجے تک رضاکاروں کے دستے اپنے اپنے کام کو چلے گئے اور کیمپ سونا رہ گیا۔

Akram Allahabadi

آج وہ کچھ بیقرار سا تھا کہ کسی طرح دوپہر چڑھے اور وہ اس کھنڈر میں پہنچ جائے جہاں وہ روح عالم لاہوت سے آ کر اس کا انتظار کرتی ہوگی۔ بہر حال کسی طرح اسٹریچر پر لوٹ پوٹ کے، یا ادھر ادھر ٹہل ٹہل کے بار بار کتابوں کو الٹ پلٹ کے اکتا گئے اور وہ خاموشی سے کیمپ سے نکل کر موت کے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ آج اس نے پتلون پر صرف قمیض پہنی ہوئی تھی۔ کیونکہ دوپہر میں پسینہ نکلنے لگتا تھا۔

جب وہ ویران کھنڈروں اور ناہموار زمین کے گڑھوں اور شگافوں کو عبور کرتا ہوا اس کھنڈر کے نزدیک پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو، اور تیز چل، کوئی انتظار کر رہا ہے، اور تیز۔ اور ہواؤں پر بجتے ہوئے مدھم مدھم لاہوتی سازوں کی آ سیبی گونج کے درمیان جب وہ اس کھنڈر میں داخل ہوا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اسی سفید باریک سے لباس میں وہ کھمبے سے ٹیک لگائے دلربانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں دروازے کے طرف ہی تھیں۔

"تم آ گئے۔" وہ اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ اور وہ رک کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"آتا کیسے نہیں، کسی کا خیال مجھے اس بری طرح کھینچتا رہا تھا کہ قدم رک نہیں پائے۔" وہ وفورِ جذبات میں کہہ گیا۔ لیکن پھر چونک کر سنجیدہ ہوگیا۔

"کافی بے تکلف ہوتے جا رہے ہو۔" روح نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اور روپ اس کے اس جملے پر سٹ پٹا گیا۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ ناراض ہو کر ایسا کہہ رہی ہے یا طنزیہ۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوگئے جنہیں دیکھ کر روح ہنس پڑی۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس کا برا مانتی ہوں۔" اس نے خود ہی کہہ دیا۔ اور روپ کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ لوٹ آیا۔

"بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو؟ تھک گئے ہوگے۔ اتنی دور سے آ رہے ہو۔" وہ نرم اور

شگفتہ انداز میں بولی۔اور روپ ڈرتے ڈرتے وہیں اس سے پانچ قدم دور اس پتھر پر بیٹھ گیا جس پر کل بیٹھا تھا۔وہ خاموش اور کھوئی کھوئی نظروں سے اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو تکنے لگا۔اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے وہ ایک لمحے کے لیے شرما گئی۔اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن فوراً ہی سنجیدگی پیدا کر لی۔وہ بولی۔"تم اس طرح مجھے گھور رہے ہو جیسے پہلی بار ہی دیکھ رہے ہو۔"اس کا سوال اچانک تھا۔روپ کو اپنی جھینپ مٹانے کا کوئی بہانہ نہ رہا، لیکن وہ اس سے کچھ جھوٹ بھی تو نہ بولنا چاہتا تھا۔وہ روح تھی۔وہ سب جانتی ہو گی۔اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھ رہا تھا کہ میں نے عورت کو اس قدر خوبصورت اور پرکشش کبھی نہیں دیکھا۔"

"شاید تم دل میں کچھ نہیں رکھتے، سب زبان پر لے آتے ہو۔" روح نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔اور خاص کر اس سے جو مجھے محبوب ہو۔" اور پھر ایک والہانہ انداز میں دل کے اندر کوئی بات اس طرح کہہ گیا جیسے اسے سب کچھ کہہ دینے کی اجازت مل گئی ہو یا جیسے وہ بھول گیا ہو کہ وہ ناراض بھی ہو سکتی ہے۔

"کیا مطلب؟" روح نے اپنا لہجہ بدل دیا۔اس کے چہرے سے مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔روپ اپنی اس دیوانگی پر پشیمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا موڈ بدلتے دیکھ کر گھبرا اٹھا۔

"میں... یعنی میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ میں... یعنی کہ میں نہ جانے کیوں تم سے کچھ چھپا نہیں سکتا۔مجھے کیا ہو گیا ہے یہ میں خود نہیں جانتا۔مگر مجھے کچھ ہو گیا ہے جو میں اپنے آپے میں نہیں ہوں۔" وہ اسی طرح منتشر اور ڈوبے ہوئے لہجے میں کہتا گیا۔اور وہ اپنی گھنیری پلکیں بار بار جھپکا کر اس کی طرف دیکھتی، اس کے الفاظ سنتی رہی۔پھر وہ اپنی نرم و نازک ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی ٹیکتی ہوئی کچھ آگے کی طرف جھک گئی جیسے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو۔

Akram Allahabadi

"میرے ساتھی بھی کہتے ہیں کہ مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے ۔وہ سمجھتے ہیں مجھ پر کوئی وہم، کوئی پاگل پن سوار ہے ۔جس دن میں نے پہلی بار تمہیں چتا کے قریب دیکھ کر انھیں بتایا تھا، وہ مجھ پر ہنس رہے تھے ۔وہ سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹ بولتا ہوں ۔مجھ پر کچھ سوار ہے ۔مثلاً کوئی آسیب..." کہتے کہتے وہ رک گیا اور پریشان سی نظروں سے پھر اس روح کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں اس وقت ایک عجیب سی بے بسی، ایک کھویا کھویا پن برس رہا تھا۔اور چہرے پر ایک ایسی معصومیت جو کسی بے گناہ کے پھانسی پر چڑھنے کے وقت اس کے چہرے سے ٹپکے۔ اس کی اس کیفیت سے متاثر ہو کر وہ مسکرا دی۔

اور اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔وہ مبہوت سا ہو گیا ۔وہ ان خوبصورت نگاہوں کی سیاہ ساکت پتلیوں میں جیسے تحلیل ہونے لگا ہو۔ایک موم کے بت کی طرح جو اندر ہی اندر پگھلتا جا رہا ہو۔یکا یک وہ چونک پڑا ۔جیسے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا ہو۔

"تمہاری آنکھوں میں لاہوتی کیفیتیں ہیں ۔ان میں موت کا جادو ہے ۔میں پاگل ہو جاؤں گا ۔تم..تم شاید مجھے بے بسی کی موت مارنا چاہتی ہو" اچانک پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔وہ کچھ حیران تھی ۔اس نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا، نگاہیں ٹکرائیں وہ سر سے پیر تک لرز گیا ۔

"مجھے ان آنکھوں سے ڈر لگ رہا ہے ۔تم مجھے پاگل بنا دینا چاہتی ہو ۔تم مجھے مارنا چاہتی ہو ۔تم آسیب ہو ۔تم روح ہو ۔" وہ وحشیانہ انداز میں پلٹ کر بھاگا ۔

"روپ ۔" مضطرب سی ہو کر وہ چلا اٹھی ۔

"نہیں ۔مجھے تم سے ڈر لگ رہا ہے ۔تم مجھے مار ڈالو گی ۔"

وہ چیختا ہوا کھنڈر سے بھاگ کر نکل گیا ۔دور کافی دور جب دوڑتے دوڑتے اس کی سانس پھول رہی تھی، اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا ۔اسی کھنڈر کے شکستہ برآمدے میں کھڑی ہوئی

Akram Allahabadi

اس روح کا سفید آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ پھر بھاگ اٹھا۔ کیمپ پہنچا تو اس کا دم اکھڑا ہوا تھا۔ چوکیدار آج بھی راستے میں ملا، لیکن اس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور سیدھا اپنے خیمے میں پہنچ کر اسٹریچر پر گر پڑا۔ اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ جیسے ہر طرف، ہر شے میں اسے اس روح کی وہی وہ پرکشش آسیبی آنکھیں نظر آ رہی ہوں۔ اور اسی طرح وہ ساکت پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام کو چٹرجی آیا تو اس نے دیکھا کہ روپ کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ چٹرجی نے جب اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو روپ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چٹرجی نرم آواز میں کہا۔

"چوکیدار کہہ رہا تھا آج بھی تم اسی طرف گئے تھے۔ محض ایک غیر موجود شے، ایک اندھے تصور کے لیے کیوں اپنے آپ کو ناس کر رہے ہو، روپ۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔" اس نے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر سمجھایا۔

"میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ بہت خوبصورت مگر بڑی دہشتناک ہیں۔" روپ بڑبڑانے لگا۔

"تمہارا یہ وہم تمہیں پاگل بنا کے چھوڑے گا۔ ایشور کیلیے ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دو میرے دوست جن کا سر پیر نہ ہو۔" چٹرجی نے پھر اسے سمجھایا۔

"تمہیں یقین نہیں۔ تمہیں کبھی یقین نہ آئے گا۔ لیکن میں اب خود وہاں نہ جاؤں گا۔" روپ نے سنجیدہ انداز میں دہرایا۔ اب وہ پہلے کی بہ نسبت پرسکون تھا۔

"اچھا بھئی یوں ہی سہی۔ چلو اب اٹھ بیٹھو۔ لو یہ پیلوڈرین کی گولی کھالو، بخار اتر جائے گا۔ مجھے بھی رات کو ہلکا ہلکا بخار ہو گیا تھا اس لیے لیتا آیا تھا۔" جیب سے کاغذ کی پڑیا نکال کر چٹرجی نے اسے اس میں سے ایک سفید رنگ کی گولی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے بخار نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ بولا۔

"بدن کچھ گرم ہے۔ احتیاطاً کھالو۔ کہا مان لیا کرتے ہیں۔" چٹرجی نے اسے

Akram Allahabadi

بچوں کی طرح سمجھایا۔

''تم تو ہر بات میں بس دادا جان بن جاتے ہو۔ لاؤ کہاں ہے۔'' روپ اٹھتے ہوئے منہ بنا کر۔ چٹرجی ہنسنے لگا۔

''آخر پردیس میں بھی ایک بڑے بوڑھے کا ساتھ ہونا ضروری ہی ہے ورنہ تم جیسے ضدی بچے کا خیال کون رکھے گا۔''

''اخاہ تو آپ سچ مچ بڑے بوڑھے بن گئے۔ ابھی تو آپ کے برابر میرے لڑکے ہوں گے۔'' روپ کی بذلہ سنجی عود کر آئی۔

''شادی ہوئی ہے؟'' آہستہ سے اس کے کان کی طرف جھک کر چٹرجی نے پوچھا۔

''نہیں ہوئی تو اب ہو جائے گی۔'' روپ بولا۔

''کس سے... نیلا سے؟'' چٹرجی نے خود سوال کر کے خود ہی جواب بتا دیا۔

''نہیں، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے اس عورت کے نام سے چڑ سی ہو گئی ہے جو تمہاری اس سوسائٹی میں جنم لیتی ہے جہاں سماج، مذہب، اخلاقیات سب بس ظاہری ڈھکوسلے ہیں اور اندر سے سب کے کیریکٹر کھوکھلے۔'' روپ نے متنفر سے لہجے میں کہا۔

خیر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ عورت کی گنتی میں ہماری ماں بہنیں بھی آ جاتی ہیں۔'' چٹرجی کو جیسے روپ کے الفاظ کچھ اچھے نہیں لگے۔ پھر بھی اس نے کہا۔

''لیکن میرا مطلب ان آج کل کی عورت نما لڑکیوں سے ہے جو محبت اور وفا کی ضد ہیں۔'' روپ نے بحث کو طول دینا چاہا، لیکن اسی وقت اتفاق سے ہنگی ناتھ گھس آیا۔

''بھئی چندہ دو۔'' وہ اندر آ کر بولا۔

''چندہ؟ کیسا؟'' چٹرجی نے پوچھا۔

''میرا جوتا کھو گیا ہے۔ نیا خرید کر لاؤں گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

Akram Allahabadi

"جوتا کھو گیا ہے، تو کیا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے آپ کا۔" روپ بیچ میں بول پڑا۔

"ارے یار راستے میں مر گیا تو کیا کریا کرم نہ کرنا پڑے گا تمھیں چندے سے؟"

ہنگلی ڈھیٹ بن کر ٹوٹک وار کرسی پر جم گیا۔

"اول تو بے غیرتوں کو موت نہیں آتی اور اگر ایسا ہوا بھی تو کفن ہم سرکار سے دلائیں گے۔" چٹرجی نے اس کا جواب چبھتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

"اے مسٹر چٹرجی پٹرجی، بہت ہو چکی اپنی بے عزتی۔ اب ہم جاتے ہیں اور جا کر کہہ دیں گے کہ یہ دو کنجوس کل کی پکنک کے لیے چندہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

ارے تو کمبخت، تو نے پکنک کا نام ہی کب لیا تھا۔ کتنا چندہ طے ہوا ہے؟" جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے چٹرجی نے ہنس کر پوچھا۔

"تین تین روپے۔" ہنگلی ناتھ پٹ سے بول پڑا۔

"اور دن میں دو دو کی باتیں ہوئی تھیں۔" چٹرجی بولا۔

"تمھارا سر۔ تم تو بنیے ہو بس بنیے۔ اچھا لاؤ، دو ہی دو۔" ہنگلی ناتھ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

"یہ پکنک کیسی؟" روپ نے چٹرجی سے پوچھا۔

"کل ہفتہ کا آرام کا دن ہے نا، اس لیے طے ہوا کہ کل شیام کنج کے علاقے میں پکنک منائی جائے۔ یہاں سے ۵ میل دور ہے۔ تفریح کے لیے بہترین جگہ ہے۔" چٹرجی نے جواب دیا۔

"میں بھی چلوں گا۔" روپ بولا۔

"مگر تمھاری طبیعت..." چٹرجی نے کہنا چاہا۔

"نہیں ٹھیک ہے۔ اور پھر یہاں اکیلے میرا دل گھبرائے گا۔" روپ نے ضد کی۔

Akram Allahabadi

"اچھا بابا چل۔" چھِڑ جی بولا۔

"ارے تم باتیں ہی بناتے رہو گے یا چندہ بھی دو گے۔" ہنگلی ماتھ تقریباً چیخ اٹھا۔

"گلا کیوں پھاڑتا ہے، یہ لے چار روپے۔" چھِڑ جی نے جیب سے چار روپے نکال کر اس کی طرف پھینک دیے۔ اور وہ انھیں اٹھا کر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پکنک

شیام کنج کوئی علاقہ نہیں تھا۔ یہ ان رضا کاروں کی اپنی ذہنی اپج تھی کہ شیام گڑھ کے راستے میں ملنے والے ایک تالاب نما گڈھے کے کنارے کی اس زمین کا جہاں ککروندوں اور برجھڑی کی پھیلی ہوئی جھاڑیاں قدرتی طور پر ایک نصف دائرے کی شکل میں اگی ہوئی تھیں، نام شیام کنج رکھ لیا تھا۔ بوس کی تجویز جب اس کے ساتھیوں نے اس جگہ کا نام شیام کنج تسلیم کر لیا تو وہ خوشی سے ایسا پھولا جا رہا تھا جیسے واسکوڈی گاما نے ہندوستان یا کولمبس نے امریکہ دریافت کر لیا ہو۔ اس نے شیام گڑھ کے پاس ایک شیام کنج دریافت کر لیا تھا، جہاں اتوار کی چھٹی کے دن ان کا پکنک کا پروگرام طے پایا تھا۔ اور اس نیک کام میں انجینئر تنگ کے تقریباً ۱۰ رضا کار بھی ان کے شریک تھے۔

اس طرح کل اٹھارہ نوجوانوں کی یہ رضا کار پارٹی دوسرے دن پروگرام کے مطابق سورج نکلنے سے پہلے ہی شیام کنج کی طرف چل پڑی۔ کیمپ کمانڈر نے بخندہ پیشانی اپنی اجازت کے ساتھ ان کی آمد و رفت کے لیے ملٹری ٹرک بھی دینا چاہا تھا، لیکن ان لوگوں نے پو پھٹتے وقت کے دھندلے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پیدل چلنے کو ہی ترجیح دی۔

آسمان کی گہری نیلاہٹوں میں سرخی کی مدھم مدھم لکیریں دنیا کے مشرقی سرے سے ابھر رہی تھیں۔ استوائی لوگوں کے لیے سورج و چاند دنیا کے مشرق و مغرب میں تقسیم رہتے ہیں۔ دور بہت دور کہیں کوئی آسامی گڈریا اپنی ریوڑ کو کجردم بنسری کی مدھر تانیں سنا رہا تھا۔ شاید بنسری کی پرکشش لے میں کھو کر بکریاں گائیں خوشی سے دودھ دیتی ہیں۔ اور نسیم سحری کے بے باک مست خرام جھونکوں میں اس کی سریلی آواز ریشم کی ڈور کی طرح لہراتی پھر رہی تھی۔ ناہموار راستے کے نشیب و فراز میں ٹھوکریں کھاتے، سنبھلتے، ہنستے بولتے، گنگناتے اور کشادہ سانسیں

Akram Allahabadi

کھینچتے وہ چلے جا رہے تھے۔ آسام کے زلزلے کی زد سے کم متاثر ہونے والے ادھر ادھر ٹیڑھے کھڑے چھوٹے بڑے درخت ابھی ابھی سو کر جاگے تھے۔ ان کے نرم اور ہرے پتوں پر سے رات کی شبنم ڈھلک ڈھلک کر نیچے کی پتھریلی زمین یا سبزے پر گرتی اور بکھر جاتی۔ چاروں طرف ہلکا ہلکا کہر تھا۔ اتنا ہلکا جیسا گلابی جاڑوں میں ہوتا ہے۔ اس طرف کا موسم کچھ ایسا ہی غیر متعین رہتا تھا۔

ہنگلی ناتھ کی مسخری شخصیت ہر سفر میں دلچسپی کا باعث رہتی۔ اس کی جوڑ کا بوس تھا جو ہر وقت اس سے لڑنے کے لیے آمادہ رہتا۔ ان دونوں کی موجودگی میں کسی کو راستے کی کسی خفیف سی اذیت کا بھی احساس نہیں ہوا اور جب وہ شیام کنج میں داخل ہوئے تو صبح صادق کی پیامبر سورج کی پہلی کرن ساگون کے ایک اتفاقیہ اگ آنے والے دراز قد درخت کی پھننگ پر رقص کر رہی تھی۔

''لو بیٹا یہاں تک تو خیریت سے پہنچ گئے۔'' بوس نے اپنا جھولا بغل سے اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بھکشا کافی مل گئی ہوگی، تھیلا وزنی معلوم ہوتا ہے۔'' ہنگلی ناتھ بھی اپنا تھیلا دوسری طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، تم سے تو کم ہی ہے۔'' بوس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ سب ہنس پڑے اور ہنگلی ناتھ لاجواب سا ہو گیا۔ پکنک کا سامان انھوں نے چھوٹے چھوٹے کئی تھیلوں میں تقسیم کر لیا تھا جو وہ دورانِ سفر میں ساتھ رکھتے تھے۔ یہ موٹے کینوس کے تھیلے باآسانی ایک چوڑی پٹی کے ذریعے بغل میں لٹکائے جا سکتے تھے۔

پہلے طے ہوا کہ ناشتہ تیار کیا جائے۔ بوس اور رمیش کی ڈیوٹی ناشتے کی تیاری پر لگی۔ چٹر جی اور پردیپ زمین صاف کرنے لگے۔ انجینئرنگ کے رضاکاروں نے وہ چھوٹے سفری شامیانے تاننے شروع کر دیے جو وقتِ ضرورت دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے استعمال

Akram Allahabadi

کیے جاتے ہیں۔ ابھی ان کی ضرورت تو نہ تھی، لیکن ایسے بھی کچھ اچھا ہی لگتا تھا۔

روپ کو چڑجی اور اس کے ساتھیوں نے یہ کہہ کر کوئی کام کرنے سے منع کر دیا تھا کہ اس کی طبیعت ابھی کچھ ناساز ہے۔ ہنگلی ناتھ زبردستی ادھر ادھر سپروائزری کرتا پھر رہا تھا۔

بوس نے نہ رہا گیا تو بگڑ پڑا۔

"یہاں ہم تمہارے چاچا جی کے نوکر بیٹھے ہیں کیا، جا کے پانی لاؤ۔ ٹہل رہے ہیں کسی لارڈ کی طرح۔"

"اے، چپ چاپ کام کرو، نہیں تو مجوری نہیں ملے گا۔" پیچھے کھڑا ہوا ہنگلی ناتھ چھڑی کی پتلی سی شاخ کو ہاتھ میں گھما کر بولا۔

"تیرے داروغہ کی ایسی کی تیسی، جاتا ہے کہ نہیں۔" بوس اسٹو جلاتے جلاتے بڑا چمچہ لے کر اس کے پیچھے دوڑا۔ اور وہ 'جاتا ہوں' کہہ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"لاتوں کے بھوت کہیں باتوں سے مانتے ہیں۔" چڑجی نے اپنا کام ختم کر کے اس فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا جو ان کے ساتھی فوجی رضا کاروں نے ابھی بچھا دیا تھا۔

ہنگلی ناتھ کا منہ بن گیا۔

فوجی رضا کار زور سے ہنس پڑے۔

"اب تو نہیں جاؤں گا۔" وہ بگڑ گیا۔

"اس نے ہمیشہ حرام کی کھائی ہے۔" بوس دور ہی سے بولا۔

"اچھا لاؤ بھئی ان کے بدلے میں لے آتا ہوں۔" ایک ساتھی فوجی رضا کار اٹھ کر بولا۔

"ارے اس کے فرشتے جائیں گے۔ یہ کون سا واجد علی شاہ کا پوتا ہے۔" پردیپ نے فوجی مشکیزہ ہنگلی ناتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں جاؤں گا تو کیا تم سب مجھے مارو گے؟" وہ بڑی معصوم سی صورت بنا کر

Akram Allahabadi

پوچھنے لگا۔

''نہیں جی، ہم تمہیں پیار کریں گے۔'' چترجی نے زمین پر پڑی ہوئی ایک کانٹوں دار سوکھی شاخ اٹھائی۔

''بس بس، دور دور۔ جاتا ہوں بابا جاتا ہوں۔'' یہ کہ کر اس نے مشکیزہ اٹھالیا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر بولا۔ ''ہے بھگوان، دیکھتے ہو تمہاری دنیا یتیموں پر کتنا ظلم کرتی ہے۔ تم چترجی کو سیدھے نرک میں بھیجنا۔ میں سفارش کرتا ہوں۔''

''اب جائے گا کہ نہیں۔'' چترجی دوڑا۔ ہنگی ناتھ مشکیزہ بغل میں داب کر تالاب کی طرف بھاگ گیا۔ سب ایک ساتھ ہنس پڑے۔

''یہ کمبخت نہ ہو تو محفل سونی سونی رہے۔'' رمیش نے گوندھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو رونا آرہا ہے۔'' دوسرا ساتھی فوجی رضا کار پیاز کاٹتے ہوئے بولا۔

''لو پونچھ لو آنسو، سسرال بھیجیں گے۔'' پردیپ نے اپنا رومال بڑھادیا۔

اور پھر سب ہنسنے لگے۔ صرف روپ ہی آج خاموش خاموش سا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب تفریح میں مشغول ہو گئے۔ دو فوجی رضا کار اور بوس اور رمیش ایک طرف بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ کچھ تالاب کی طرف گھومنے چلے گئے۔ چار پانچ ایک طرف بیٹھ کر گراموفون ریکارڈ بجانے لگے، جو پردیپ اپنے ساتھ لایا تھا۔

یہ فوجی اور غیر فوجی رضا کار آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ سوائے خاکی وردیوں اور سادہ لباس کے ان میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسے جیسے سب پرانے ساتھی ہوں۔

چترجی اپنے کیمرے سے ایک ٹیلے پر کھڑا ادھر ادھر کی تصویریں لے رہا تھا اور روپ ایک طرف ایک درخت کے سائے میں بیٹھا کسی گہرے خیال میں مستغرق ایک ہاتھ سے زمین سے گھاس کے تنکے اکھاڑ رہا تھا۔ ہنگی ناتھ نے وقتی طور پر چپ سادھ لی تھی۔ بوس نے

آواز بھی دی تو کہہ دیا۔ "ذرا ناشتہ ڈٹ کر کر لیا تھا، اس لیے ہم آرام کر رہے ہیں ابھی۔" اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے وہ گکروندے کی ایک جھاڑی تلے اپنا کوٹ بچھا کر اسی پر لیٹا رہا۔

"روپ، تم آج کچھ خوش نظر نہیں آ رہے ہو، کیا بات ہے آخر؟" چٹرجی نے کیمرے میں فلم کا نمبر تبدیل کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، یونہی ذرا طبیعت گھبرا رہی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا اس روح کی یاد آ رہی ہے؟" چٹرجی نے مذاقاً کہا۔

"اوں؟" وہ چونکا۔ "نہیں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ جو ہوا وہ میرا آنکھوں دیکھا ہے۔ پھر آخر ایسا ہوا کیوں۔" وہ پھر اپنے ان ہی خیالوں میں بھٹکنے لگا

"چھوڑو بھی، جس چیز کو جتنا محسوس کرو گے وہ دماغ اور دل پر اسی قدر مسلط ہو گی۔"

روپ خاموش رہا۔

"آؤ، کچھ کھیلیں گے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔

روپ بھی کچھ نہ بولا، خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں بیٹھ کر رمی کھیلنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

دوپہر کو ساڑھے ۱۱ بجے کھانا کھا لیا گیا۔ اس کے بعد ہر ایک اپنی اپنی مرضی کے مطابق تفریح کرتا رہا، لیکن روپ نہ جانے کیوں جیسے جیسے دوپہر چڑھی اور ڈھلی بہت پریشان اور بیقرار ہوتا جا رہا تھا۔ چٹرجی نے لاکھ اسے بہلانا چاہا، لیکن اس نے طبیعت کا بہانہ کر دیا۔ وہ بار بار ان لوگوں سے دور ایک طرف اکیلا بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتا اور چٹرجی اسے اکیلا چھوڑتا نہیں تھا۔ وہ بھی اس کے پاس پہنچ جاتا اور اسے دوسری باتوں میں زبردستی الجھانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اس وقت جب سورج سر پر آیا اور کلائی کی گھڑیوں نے ۱۲ بجائے وہ مضطرب ہو کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد ہو جاتی کبھی معتدل۔ وہ اندر سے بہت بے سکون معلوم ہو رہا

تھا۔بار بار اس کا جی چاہتا کہ ان سب کو یہیں چھوڑ کر چلا جائے، لیکن چٹرجی سے اس طرح بچ نکلنا آسان نہ تھا۔نہ جانے کیوں وہ سورج کے ڈھلنے کے ساتھ نڈھال سا ہونے لگا۔ایک بار تو وہ بڑبڑا اٹھا۔'وہ ضرور میرا انتظار کر رہی ہوگی۔اف، میں نے اسے دھوکا دیا'۔اور پھر وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر ٹہلتا رہا۔اس نے اس روح کو،ان پچھلے دنوں کے واقعات کو بھولنے کی ایک جھوٹی کوشش کی تھی۔وہ کامیاب نہ ہوسکا۔اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی اس کے دل کو سینے سے کھینچ رہا ہے۔بار بار اس کی نگاہوں میں وہ ویران کھنڈر رقص کرنے لگتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔نہ جانے کیوں اس وقت اسے اس روح کے خیال سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔جیسے تحت الشعور میں چھپا ہوا کوئی جذبہ اس کی قوتِ ارادی کو مفلوج کر کے اسے ان ویران کھنڈروں کی طرف دھکیل رہا ہو جہاں ایک روح،ایک لاہوتی حسن و لطافت کا پیکر،ایک مردہ لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔کاش وہ اس وقت بھی جا سکتا،مگر نہ جا سکتا تھا۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں آ کر اس نے غلطی کی ہے۔کیونکہ اس کا دل تو شیام کنج میں اس کے جسم کو چھوڑ کر خود موت کے شہر میں بھٹک رہا ہے۔آخر یہ ہے کیا؟ محبت؟ ایک روح ہے؟ ہواؤں کے پردے پر لہراتے ہوئے ایک خوبصورت عکس ہے؟ میرے خدا! ایسا کیوں ہے؟

وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔محبت تو اس نے کسی سے نہیں کی۔وہ محبت کرتا ہی نہیں۔پھر یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا دل اندر سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔مگر کیوں؟ اس کا جواب نہ دے کر دل کا صرف ایک خاموش اشارہ تھا،'وہیں چلو'۔اور نظریں اپنی تشنگی کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں جب اس نے کوئی کھوئی نگاہوں سے پس و پیش پر نظر ڈالی۔کوئی ایسی چیز یہاں نہ تھی جو اسے تسکین دے سکے۔

"روپ، یہ حماقتیں چھوڑ دو، ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گے۔" چٹرجی نے اس کی کیفیت سے متاثر ہو کر پر خلوص لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں، مجھے کچھ بھی تو نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سر کو جھٹکتا ہوا

Akram Allahabadi

زبردستی ساتھیوں کے اس مجمع میں جا شامل ہوا جو چاروں طرف سے ہنگلی ناتھ کو گھیرے بیٹھا تھا اور ان کے درمیان ہنگلی رامپور کا قوال بنا ہوا اپنی بے ہنگم آواز میں کسی شاعر کی چرائی ہوئی غزل کو اپنے نام سے سنا رہا تھا۔ فوجی رضا کار ضرورت سے زیادہ داد دے رہے تھے، کیونکہ ان کی زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں۔ یونیورسٹی والے کبھی کبھی واہ واہ کر دیتے، کبھی زیر لب مسکرانے لگتے۔ ایک شعر پر بوس چیخ اٹھا۔

"مرے بے حیا، مرے بے حیا۔ کیا خوب شعر کہا ہے کسی شاعر کا۔" ہنگلی بگڑ گیا۔ فوجی ساتھیوں سے بولا۔

"اس بد تمیز کو محفل سے نکال دو۔ اتنا بھی نہیں جانتا کہ داد کیسے دی جاتی ہے۔"

"جیسے تمہارے باپ کا کہا ہوا شعر تھا نا۔" سرگوشی کے لہجے میں بغل سے پردیپ بول اٹھا۔

"ارے تو بھی چلا نال ٹھکوانے۔" ہنگلی ناتھ اس کی طرف گھوم پڑا۔

"اچھا اچھا سناؤ، سناؤ۔ شاباش، بہت اچھا کہتے ہو، حرامخور کہیں کے۔" چٹرجی نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اسے چمکار کر کہا۔

"تو گالی کیوں دیتے ہو۔" اس نے بچوں جیسی صورت بنا کر شکایت کی۔

"وہ تو پیار سے دی تھی۔ اچھا سنا ڈالو۔" چٹرجی سنجیدگی سے بولا اور اس پر روپ بھی ہنس پڑا۔

ہنگلی ناتھ کا مشاعرہ پھر شروع ہو گیا۔

ان ہی خوش فعلیوں میں شام کے ۵ بج گئے اور آخری شام کی چائے پی کر سب نے ڈیرہ اٹھا دیا۔ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح ہنستے ہنساتے کیمپ کو لوٹ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

وہ رات روپ نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اپنی دانست میں اس نے اس روح سے اس کے تصور سے فرار حاصل کرنا چاہا تھا، لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ صرف ایک دن کے تعطل سے اس کی زندگی میں کتنا اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ جیسے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ وہ عالمِ بالا کی مکین ایک ایسی شے ہے نہ جس کے قریب ہوا جا سکے، نہ جس کو اپنا بنایا جا سکے بجز موت کے۔ اور نہ جسے چھوا جا سکے۔ محض ایک ہوا۔ وہ اسے اپنے دل و دماغ سے اس قدر قریب پا رہا تھا کہ جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے زبردستی اسے ایک ایسے تصور میں جکڑ کر رکھ دیا ہو جو نہ زائل ہو سکے نہ جس کی گرفت ڈھیلی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اس دیوانگی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ چند دھندلے غیر مربوط لمحے اور موت۔ جس راہ وہ بڑھ رہا تھا اس کی منزل کہیں نہ تھی۔ اور ہو بھی تو شاید ان آسمانوں سے پرے جو خود بھی ایک خلا ہیں اور جن کے بعد بھی خلا ہی خلا ہوں گے۔ نہ کوئی ٹھوس حقیقت نہ کوئی ٹھوس وجود۔ پھر کیا خلاؤں میں تحلیل ہونا ہی زندگی کی معراج ہے۔ زندہ آدمی کے لیے تو یہ سوچنا بہت مشکل تھا، مگر سوچے یا نہ سوچے وہ مجبور تھا۔ ضبط وفرار کی پہلی کوشش ہی ناکام ہو کر اضطراب وکشش کے ہاتھوں لٹ گئی تھی اور وہ تو اب تڑپ رہا تھا کہ کسی طرح صبح ہو، کسی طرح دن چڑھے اور اس کے قدم موت کے شہر کی طرف بھاگنے لگیں۔

آخر صبح بھی ہو گئی اور دن بھی چڑھ آیا۔ آج پھر اس نے چڑجی سے طبیعت کے مضمحل ہونے کا بہانا کر دیا تھا کیمپ کمانڈر کو درخواست بھیج دی۔ چڑجی اور کر ہی کیا سکتا تھا بجز اس کے کہ اسے چند دواؤں کے استعمال کی ہدایت کر دے، لیکن وہ کیمپ میں دوپہر کو رہنے والے فوجی چوکیدار کو کام پر جاتے ہوئے یہ جتاتا گیا کہ آج اگر روپ کہیں روپ جائے یا آئے تو اس پر نظر رکھنا اور مجھے بتا دینا کہ کہاں اور کب گیا تھا، کب آیا۔

وہ خود بھی رک سکتا تھا، لیکن اپنے رضا کار دستے کے ساتھ اس کا جانا ضروری ہی سمجھا

Akram Allahabadi

جاتا تھا۔ دوسرے اگر روپ کو یہ احساس ہوتا کہ چٹر جی اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے تو دوستی کا نازک دل اسے تلخ ضرور سمجھتا۔ وہ خود تو چلا گیا، لیکن روپ کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ صرف اپنے خیمے میں آرام کرے گا، وہ احتیاطاً چوکیدار کو ہدایت کرتا گیا۔

ابھی دوپہر میں کافی دیر تھی، لیکن روپ کا اضطراب زوروں پر تھا، جیسے گھڑی کی سوئیاں سست پڑ گئی ہوں، یا سورج جان بوجھ کر آج آہستہ چل رہا ہو۔ وہ بار بار وقت دیکھتا اور پھر اسٹریچر پر گر پڑتا۔ کپڑے اس نے پہلے ہی تبدیل کر لیے تھے۔ ایک بار باہر جھانک کر دیکھا تو پہرے دار کینٹین کے دروازے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا چپکے سے اپنے خیمے سے نکل کر وہ تیز تیز چلتا ہوا کیمپ کی داخلی چوکی سے گزر کر ایک ٹیلے کی آڑ میں ہو لیا۔ اتنے میں پہرے دار اطمینان سے ٹہلتا ہوا اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔ وہ اس خشک نالے کو عبور کرتا ہوا ورکی ہوئی سڑک کو پار کر کے موت کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب وہ آہستہ چل رہا تھا، کیونکہ ابھی صرف سوا گیارہ بجے تھے اور وہ خاص طور پر دوپہر کے وقت آتی تھی۔ ویرانوں میں روحوں کی تفریح کا وقت خاموش دوپہر یا آدھی رات کا ہوتا ہے۔

جب وہ موت کے شہر کے ان شکستہ آثار کے درمیان سے گزر رہا تھا تو اس کی گھڑی میں ۱۲ بج رہے تھے۔ اس کی رفتار اور تیز ہو گئی جیسے طبیعت اندر ہی اندر گھبراتی جا رہی ہو۔

اس ٹیلے پر چڑھتے ہوئے کھنڈر کے نزدیک پہنچ کر وہ تقریباً دوڑنے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر اس کے نزدیک جا پہنچے۔ عجیب اضطراب تھا۔ پرسوں وہ اس جگہ سے خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا اور آج کشاں کشاں چلا آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اسے جلد جلد دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ روٹھ نہ گئی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آج آئی ہی نہ ہو۔

ورانڈے کے نزدیک پہنچ کر وہ دوڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ یکا یک اس کی اضطرابی کیفیتیں چہرے پر پھیلتی ہوئی ایک سرخ لہر میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ اپنے اسی مخصوص انداز سے

اسی کھمبے کے سہارے، اسی سفید باریک لباس میں لپٹی ہوئی آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔اس کی گھنیریں پلکیں، پلکوں کا پھیلاؤ، آنکھوں کے ڈھلوان کے نیچے سرخ وسفید رخساروں پر خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔کسی کے دوڑتے قدموں کی چاپ سن کر وہ چانک پلٹی اور پھر روپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے اچانک بجھے دیے روشن ہو جائیں۔وہ جذباتی طور پر اس وقت اس قدر بے اختیار ہو رہا تھا کہ اسے دیکھ کر وہ اپنے احساسِ مسرت کو دبا نہ سکا اور والہانہ انداز میں، "اوشا" چیختا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔شاید وہ اس جنون میں پہنچ کر اس ہوا سے ٹکرا جاتا، لیکن راہ میں پڑے ہوئے ایک اونچے پتھر کی ٹھوکر درمیان میں حائل ہوگئی اور وہ لڑکھڑا کر اس روح سے دو قدم دور ہی گر پڑا۔اس کے گرنے پر وہ جیسے تڑپ سی گئی۔اس کے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیل گئے۔ملبے کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ایک نوکدار پتھر سے ٹکرا کر اس کی پیشانی زخمی ہوگئی اور اس میں سے خون نکل آیا، لیکن اسے جیسے اس کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔وہ سنبھلتے ہی اوشا کو تکتا رہ گیا۔اس کا آگے بڑھا ہوا ایک ہاتھ اچانک رک گیا۔اسے یاد آ گیا کہ وہ ایک روح ہے۔روح جو ہوا میں ہوتی ہے اور اس لیے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اسے چھوتے ہوئے ڈرتا تھا۔اسے اس احساس سے تکلیف بھی ہوتی تھی کہ وہ صرف ہوا ہے۔وہ ٹھوس نہیں ہے۔جذبۂ خوف اس قرب سے پھر کسی قدر عود کر آیا اور وہ سنبھل کر پیچھے ہٹتا ہوا اسی پتھر پر بیٹھ گیا جس پر پہلے بیٹھا تھا۔وہ اس سے ۵ قدم دور ہی بیٹھتا تھا۔اور اس کے باوجود کہ وہ اسے دیکھنے کے لیے بہت بیقرار ہو کر دوڑا ہوا آیا تھا، اس حقیقت کو وہ نہ بھولا تھا کہ وہ اسے صرف دیکھ سکتا ہے اور اگر لاشعور میں چھپے ہوئے کسی جذبۂ محبت کی تسکین صرف اتنی رعایت سے ہو سکتی ہے تو وہ اسے حاصل تھی۔

اوشا کی روح نے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ سکیڑ لیے۔شاید اسے بھی یاد آ گیا کہ میں ایک روح ہوں۔

"تمہارے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے، اسے پونچھ کر اپنا رومال باندھ لو۔" وہ محبت

بھرے انداز میں بولی۔

"خون ...اوہ..." اسے اس زخم کا احساس ہوا۔ ماتھے کو ٹٹولتے ہوئے جب اس کی انگلیوں میں خون بھر گیا جو کان کی لو تک بہہ آیا تھا تو اس نے جیب سے سفید رومال نکال کر اسے پونچھتے ہوئے اسی سے زخم کو باندھ لیا۔ زخم معمولی تھا اس لیے خون اور نہ بہا۔

"مجھے تو اس کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔" وہ اپنی اکھڑی سانسیں درست کر کے بولا۔

"کیوں؟" روح نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہ جانے کیوں تمہیں دوبارہ یہاں موجود دیکھ کر خوشی میں اس قدر کھو گیا تھا۔" اس نے اپنے دل کی باتیں بلا جھجک زبان پر لا کر کہا۔

"مگر تم تو مجھ سے ڈر کر بھاگ گئے تھے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں، لیکن میں ان آنکھوں کے سحر سے بچ نہیں سکتا۔ کل سے میرا دل اس قدر بیقرار تھا کہ اگر میرے پر لگ جاتے تو اڑ کر یہاں پہنچ جاتا۔" وہ بے اختیارانہ کہہ گیا۔

"لیکن ایک روح سے محبت کرنے کا انجام جانتے ہو؟" اوشا کی روح نے سنجیدگی سے کہا۔

"محبت؟" وہ اپنے دل کو ٹٹولنے لگا۔ "یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"لیکن... لیکن میں بالکل بے بس ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ بس اس قدر معلوم ہے کہ میری روح کو، میرے دل کو تم سے جو وابستگی ہو گئی ہے، وہ مجھے تمہارے بغیر کہیں چین سے نہ رہنے دے گی۔" وہ آج سب کچھ کہہ گیا۔

"آخر ہار گئے نا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"شکست تسلیم ہے۔ میں نے بہت کوشش کی تھی اپنے آپ پر قابو پانے کی، لیکن نہ

Akram Allahabadi

پا سکا۔تم ..یا تو جادوگر ہو،یا شاید روحوں میں کسی کے دل کو کھینچ لینے کی طاقت ہوتی ہے۔مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا ہے جیسے...جیسے تمہارے بغیر مجھے سکون ملنا ناممکن ہے۔"

"شکر ہے کہ تم محبت کے قائل تو ہوئے۔"وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کی پتلیاں گھما کر بولی۔

"دنیا والوں کی بے وفائیوں نے محبت کو صرف ایک زبانی فلسفہ بنا دیا تھا،لیکن اب ...اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جذبہ انمٹ اور بے اختیاری ہے۔"روپ نے جواب دیا۔

"اور اگر یہی سپردگی محبت ہے تو میں اس کا قائل ہوں۔"روپ نے اقرار کیا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔"روح نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اگر تم ناراض بھی ہوتیں تب بھی شاید میں خاموش نہ رہ سکتا۔جذبات کی شدت مجھے پاگل بنا دیتی ہے۔میں چیخ چیخ کر سب کچھ کہہ ڈالتا۔"وہ اس کے حسین چہرے کو بجائے خوف کے محبت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بڑے جذباتی معلوم ہوتے ہو۔"اس نے ایسی ادائے محبوبانہ سے اسے منہ چڑا کر کہا کہ اس کا دل سینے میں مچھلی کی طرح تڑپ اٹھا۔

"کاش تم زندہ ہوتیں۔"ایک لمبی سی سرد سانس کے ساتھ اس کے لبوں سے نکل گیا۔

"شاید محبت کے سامنے قدرت ہار جائے اور مجھے دوبارہ زندگی بخش دی جائے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟"وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

"مارنے اور جلانے والے کے لیے کچھ بھی ناممکن نہ ہونا چاہیے۔"اس نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

"اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو میں اس کے سامنے اپنا سر پھوڑ کر بھی تمہاری دوبارہ زندگی کے لیے بھیک مانگوں گا۔"روپ نے محبت کے شدید جذبات سے لرزتے ہوئے لہجے میں

Akram Allahabadi

جواب دیا۔ اور اوشا کی روح یہ دیکھ کر پیار بھری نظروں سے اسے تکنے لگی کہ اس جملے کے ادا کرتے کرتے فرطِ تاثر سے روپ کی پلکیں بھیگ اٹھی تھیں۔

"محبت خود سب سے بڑی دعا ہے۔ وہ قدرت کو اپنی تکمیل کے لیے مجبور کرسکتی ہے، اگر اپنی انتہا پر ہو۔" اوشا کی روح نے سمجھایا۔

"مرنے سے پہلے تم ضرور پڑھی لکھی لڑکی رہی ہوگی؟" روپ نے سوال کیا۔

"ہوں۔" اوشا کی روح نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں مچکا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"تمہاری شادی ہوچکی تھی؟" روپ پوچھ بیٹھا۔ مگر پھر فوراً ہی سوچ میں پڑ گیا کہ آیا اسے ایسا پوچھنا چاہیے تھا یا نہیں، لیکن وہ آگے کی طرف ذرا جھک کر مسکرا دی۔

"اونہہ نہہ۔" اس نے سر ہلا کر انکار میں جواب دیا۔ اور اس جواب کو سن کر آپ ہی آپ روپ کا چہرہ خوشی سے سرخ سا ہوگیا۔ اوشا کی روح نے اسے محسوس کیا اور اس کی حسین مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے دونوں سروں تک پھیل گئی۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟" اس نے تیسرا بے جھجک سوال بھی کر ڈالا، لیکن اس بار وہ جھجکا نہ تھا۔

"شاید۔" اس نے اپنی مسکراتی آنکھیں روپ کے چہرے پر گاڑ کر کہا۔

اس جواب سے میرے دل کو تسکین تو نہ ہوگی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو اپنے ہی دل سے پوچھ لو۔" اوشا کی روح نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو کہتا ہے کہ تم میرا ہی انتظار کررہی تھیں۔" روپ نے دل کی طرف سے جواب دیا۔

"دل جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ پہلے میں یہاں تفریح کرنے آتی تھی اور اب صرف تمہارے لیے آتی ہوں۔" روح نے آخر اقرار کیا۔ روپ کا چہرہ کھل اٹھا۔

Akram Allahabadi

تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت..." کہتے کہتے اس کے لہجے میں ایک آرزو پیدا ہو گئی، جیسے وہ اپنے دل کی بات اسی سے کہلانا چاہتا ہو۔

"اور کیسے اقرار کراؤ گے اب؟ بڑے ضدی معلوم ہوتے ہو۔" اس نے چبھتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ستون کے سہارے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا، کیا تمہاری دنیا والوں کو معلوم ہے کہ ہم یہاں ملتے رہتے ہیں؟" اس نے ذہن کی کرید کو سامنے رکھ دیا۔

"کچھ ہے کچھ نہیں۔"

"بہر حال مجھے تم سے ملنے کی اجازت ہے، لیکن اس حد تک کہ کوئی اور نہ دیکھ پائے، ورنہ شاید پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔" روح نے جواب دیا۔

"ایسا نہ کہو، کبھی نہ ملنے کے خیال سے ہی میرا دل لرز اٹھا ہے۔ ایشور نہ کرے ایسا ہوا تو مجھ پر زندگی دوبھر ہو جائے گی۔" روپ کا لہجہ اداس ہو گیا۔

"مایوس کیوں ہوتے ہو، ہمیں محبت پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔" اوشا کی روح نے اسے ہمت دیتے ہوئے کہا۔ اور وہ پھر روپ پرسکون ہو گیا۔

"ارے یہ کب گر پڑی؟" روپ کی نظر نیچے زمین پر پڑی ہوئی اپنی نوٹ بک پر پڑی۔ ٹھوکر کھا کر گرتے وقت وہ اس کی جیب سے نکل کر نیچے آ رہی تھی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ روح نے جھک کر اس کی نوٹ بک اٹھالی۔ شاید دونوں ہاتھ اسی نوٹ بک پر ٹکرا جاتے، لیکن روپ نے اسی ڈر سے ہاتھ کھینچ لیا کہ ہوا سے ہاتھ چھو نہ جائے۔ دراصل وہ اپنے احساس میں اوشا کی روح کو ایک وجود کی حیثیت ہی نہ دینا چاہتا تھا۔ اسے چھو کر یہ محسوس کرنے سے کہ وہ ہوا ہے، اسے ایک قسم کی روحانی اذیت ہوتی اور پھر نہ جانے ایک روح کو چھو لینے کے نتائج کیا ہوں۔

وہ خود بھی محتاط تھی، لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ روپ آپ ہی اس کا لحاظ رکھتا ہے، اس

ے زبان سے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ اسے کھول کر دیکھنے لگی۔

"یہ تمہاری تصویر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے کلکتے میں کھنچوائی تھی۔" نوٹ بک کے اندر ایک چھوٹے خوبصورت دفتی کے فریم میں اس کی تصویر چپکی ہوئی تھی۔

"یہ نوٹ بک میں اپنے پاس رکھوں گی۔ تمہاری یادگار رہے گی۔ وہ اسے اپنے سفید ساری نما لباس میں سینے کے قریب اندر رکھتے ہوئے بولی۔

"اور مجھے؟" اس کے لہجے میں ایک مسکراتا ہوا سوال تھا۔

"تم یہ لو۔" اس نے اپنے ریشمیں چمک دار بالوں کے جوڑے سے ایک ٹیسو کا سرخ پھول نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔ روپ نے اسے اٹھالیا اور اسے اپنی جیب کے اوپر کوٹ کے کالر میں لگالیا۔

آج وہ رات دیر سے سونے کے سبب ہوجانے والے زکام کے ہلکے اثر کی وجہ سے پتلون پر کوٹ بھی پہن کر آیا تھا۔

"اچھا اب میں جاتی ہوں، میرا وقت ہوگیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کاش تم ہر وقت میرے سامنے رہ سکتیں۔" روپ نے بھی اپنی جگہ کھڑے ہوکر آرزو کی۔

"بڑھتی ہوئی آرزو ہوس کا نام ہے اور پھر میں بالکل آزاد بھی نہیں۔" اس نے مسکرا کر قدم آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"دل کی آواز ہے۔" روپ نے جواب دیا۔

"اس سے کہو صبر اور ہمت سے کام لے۔" اس نے آخری جملہ کہا اور اسی محبوبانہ انداز خرام سے چلتی ہوئی اندر کے بڑے شکستہ کمرے میں گھوم کر پچھلی دیوار کے شگاف میں غائب ہوگئی۔ صرف آوارہ ہواؤں کے جھونکے شکستہ در و دیوار کی دراڑوں میں سنسناتے رہ

Akram Allahabadi

گئے ۔موت کا شہر اسی طرح خاموش اور اداس سو رہا تھا اور فضاؤں میں موہوم مدھم لاہوتی موسیقی کی غیر مربوط لہریں تیر رہی تھیں ۔

وہ مسرت اور سکون کے احساس سے جھومتا، گنگناتا گزرتے ہوئے حسین لمحات کے تصور میں کھویا رہا ۔ویران کھنڈروں کو عبور کرتا کیمپ کی طرف چل دیا ۔

☆☆☆☆☆☆

یہ سر پر زخم کیسا ہے؟'' شام کو چٹرجی نے اس کے ماتھے کا زخم دیکھ کر پوچھا ۔وہ آج کام سے جلدی ہی لوٹ آیا تھا ۔روپ کی ان دنوں کی کیفیت نے اسے روپ کے لیے زیادہ پریشان کر رکھا تھا ۔ایک تو دوستی کا خلوص، دوسرے چاچا جی روپ کے پتا کا خیال کہ اگر خدانہ کرے روپ کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کہیں گے کہ چٹرجی، تم بھی تو ساتھ گئے تھے، تم نے کچھ نہ کیا؟' احتیاطاً اس نے کل ہی روپ کے پتا کو ایک چھٹی لکھ کر روپ کی تمام کیفیت لکھ دی تھی ۔ پھر بھی وہ روپ کی طرف سے غافل نہ رہنا چاہتا تھا ۔اس کے ماتھے پر چھوٹے زخم کا نشان دیکھ کر اسے پوچھنا ہی پڑا ۔

''کچھ نہیں، ایسے ہی ایک جگہ پیر پھسل گیا تھا ۔'' روپ نے بہانہ بنایا اور مسکرا دیا ۔وہ آج خوش تھا، اس لیے چٹرجی سے لڑنا نہ چاہتا تھا، مگر اس کو کیا کرے کہ چٹرجی آج ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا ۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے ۔چوکیدار تک نے مجھے بتایا ہے کہ آج پھر تم اس طرف گئے تھے ۔'' چٹرجی نے اس کے سامنے چیر کی فولڈنگ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔

''خیر، یوں ہی سمجھ لو ۔'' روپ پھر مسکرا دیا ۔

''دیکھو روپ، یہ پاگل پن تمھیں کہیں کا نہ رکھے گا ۔ایشور کے لیے اب بھی ہوش میں آؤ ۔'' چٹرجی نے ملائم ہو کر محبت سے سمجھایا ۔

Akram Allahabadi

"پاگل پن کیسا؟ آخر تم ایک حقیقت کو پاگل پن کیوں تصور کر رہے ہو؟" وہ بولا۔

"پھر وہی۔" چٹر جی بھڑکا۔

"میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ جو کچھ حقیقت ہے۔ آج بھی وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ آج ہم میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس نے اپنی روحوں کی دنیا کی بہت سی باتیں بتائیں۔ اور آج، آج تو اس نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ صرف میرے لیے ہی وہاں آتی ہے اور کوئی تو اسے دیکھ نہیں سکتا اور اگر دیکھ لے تو وہ پھر کبھی نہ آسکے گی۔" ایک بار پھر روپ نے معنی خیز انداز میں اسے یہ سمجھاتے ہوئے کہ وہ کبھی اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرے، بتایا۔

"کیا تم اس بھیانک تصور سے دستبردار نہیں ہو سکتے؟" چٹر جی نے تقریباً ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔

"یہ اب میری موت اور زندگی کا سوال بن گیا ہے۔" روپ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور غریب نیلا؟" چٹر جی نے اسے ایک رشتے کے بارے میں یاد دلایا۔

"میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر میرے سامنے اس ایک سوال کو بار بار دہرانے سے فائدہ؟" روپ کسی قدر ترش ہو گیا۔

"خیر اگر اب میں تمہاری نظروں سے اتنا گر چکا ہوں کہ میری باتیں بھی تمہیں ناگوار گزرتی ہیں، تو مجھے اپنی حماقتوں کا افسوس ہے۔" چٹر جی اداس ہو کر اٹھنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر شدید غمناک کیفیت نمایاں تھی۔ روپ تڑپ اٹھا۔ وہ اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو، دوست۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے میں اس کے لیے بالکل مجبور ہوں۔ ایشور کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اس معاملے میں کسی کی دخل اندازی میری زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔" روپ نے اس سے دوستانہ التجا کی۔

Akram Allahabadi

"خیر مجھے کیا، لیکن تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔" چٹر جی مختصر سا جواب دے کر پھر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد دونوں نے اس روٹھے روٹھے سکوت سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے گفتگو دوسرے موضوع پر شروع کر دی۔

چٹر جی زندگی کے پچھلے واقعات پر تبصرہ کرنے لگا۔ روپ نے بچپن کی باتیں چھیڑ دیں۔ جب وہ کسی مناسب موضوع کو درمیان نہ پاتے تو اکتاہٹ دور کرنے کے لیے ایسی ہی بے سروپا کی باتیں چھیڑ دیا کرتے تھے۔

شام ہونے کو آئی تو دونوں خیمے سے نکل کر باہر ٹہلنے لگے۔ پھر کینٹین میں چلے گئے۔ روپ آج مطمئن اور بشاش تھا، اس لیے چٹر جی کے ساتھ گھومتے ہوئے اسے جھنجلاہٹ محسوس نہ ہو رہی تھی اور چٹر جی اسے تنہا پسندی سے دور رکھنے کی کوشش میں ان نفسیاتی اثرات سے کام لے رہا تھا جو دوستوں اور ہم مذاق ساتھیوں کی ملی جلی بیٹھ سے پیدا ہونے والی دلچسپی کی صورت میں اس کے شعور پر مسلط ہو سکتے۔ دوستوں کی پر لطف صحبتوں کی دلچسپیاں بعض اوقات خشک سے خشک اور علیحدگی پسند آدمی کو بھی ان کے رنگ میں رنگ دیتی ہیں۔ مگر وہ غلط سمجھا تھا۔ روپ نہ اس قدر خشک تھا نہ فرار پسند۔ البتہ وہ جب کسی خاص چیز یا کسی خاص بات سے زیادہ متاثر ہوتا تو اس پر سوچنے یا مزے لے لے کر یاد کرنے کے لیے اسے تنہائی بھلی معلوم ہوتی۔ اس یکسوئی میں یا تو اسے ایک گداز گداز اضطراب یا پھر ایک شیریں شیریں سکون ملتا تھا۔ اور یہ کوئی مردم بیزاری نہ تھی۔ کینٹین میں کچھ فوجی رضا کاروں کے علاوہ بوس اور ہنگلی اور رمیش بھی موجود تھے اور خوب گرما گرم بحث چھڑی تھی۔ موضوع زیر بحث کچھ عجیب سا تھا۔ یعنی یہ کہ گدھے کے سر پر سینگ کیوں نہیں ہوتے۔ یہ سوال ہنگلی کا پیش کیا ہوا تھا اور اس پر جو بحث ہو رہی تھی وہ بھی عجیب نوعیت کی تھی۔

ایک فوجی رضا کار اپنی اہلیت کا سکہ میٹرک پاس ہونے کے سرٹیفکٹ سے جماتے

Akram Allahabadi

ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''واہ ہوتے کیوں نہیں، افریقہ میں ہوتے ہیں۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''کوئی ثبوت؟''

وہ بولا۔ ''اسے جبرا کہتے ہیں۔''

اس پر بوس بیچ میں بول اٹھا۔ ''جبرا نہیں، اسے الجبرا کہتے ہیں، گدھے کہیں کے۔''

''کیا؟'' اس فوجی رضا کار کی بھوئیں تن گئیں۔ بوس نے فوراً گھبرا کر جملے کے معنی بدل دیے۔

''یعنی کہ گدھے ہی تو ہوتے ہیں وہ وہاں کے۔'' بوس جلدی سے بول اٹھا اور فوجی رضا کار اپنی اس تائید پر خوش ہو گیا۔

نریش نے کہا۔ ''یعنی اپنی سمجھ میں تو نہیں آیا یہ فلسفہ۔ میرا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ اس پر چڑھے تھے اس لیے اسے ملائم ملائم ہی رہنے دیا گیا۔'' پاس بیٹھا ہوا چھٹا کم گو رضا کار رحمن جلدی سے اپنی مسلمانی کا اعلان کرتے ہوئے بول اٹھا۔

''واہ حضرت عیسیٰ گدھے پر کب چڑھے تھے، وہ تو اونٹ پر چڑھے تھے۔''

''ارے واہ برخوردار، اتنا بھی معلوم نہیں۔ پھر کیا خر عیسیٰ آپ کو کہتے ہیں؟''

ایک فوجی رضا کار نے جو خود بھی مسلمان تھا، اپنے فارسی داں ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ ''بھئی یہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، پھر سے سوچو۔'' بوس نے کہا۔

''میں بتاؤں؟'' ایک دوسرا فوجی ساتھی اپنی جگہ سے اچھلا۔

''ہاں بتاؤ۔'' سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کینٹین کا حوالدار میجر بھی اپنی جگہ کاؤنٹر پر بیٹھا بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا اور ٹیڑھا مسئلہ زیر بحث ہے۔

''ٹنڈرا میں گدھوں کے سینگ ہوتے ہیں۔ اپنے یہاں اس لیے نہیں ہوتے کہ خط استوا ہندوستان کے بیچ سے گزرتا ہے۔ گرمی کی شدت سے اس کے سینگ یا تو اندر ہی اندر گل

Akram Allahabadi

جاتے ہیں یا پیدا ہی نہیں ہو پاتے۔" اس نے بڑے فخر سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ کوئی جغرافیائی ماہر معلوم ہوتا تھا۔

"ہونہہ، خطِ شیطان بھی تو گزرتا ہے یہاں سے۔" رمیش نے برا سا منہ بنایا۔

"شیطان نہیں سرطان۔" بوس نے ٹانگ اڑا دی۔

"ایک ہی بات ہے۔" فوجی ساتھی راجندر سنگھ مسکرا دیا۔

"خیر اب کوئی حل نہیں کر سکتا تو میں کیے دیتا ہوں۔" ہنگی ناتھ نے اپنی جگہ سے کسی صدر اسمبلی کی طرح اکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ سب اس کی صورت دیکھنے لگے۔ ان میں سے تقریباً ۵۰ فیصدی تو بالکل سنجیدہ تھے، باقی دلچسپی لے رہے تھے۔ ہنگی ذرا بلند آواز میں بولا۔

"گدھے کے سر پر سینگ اس لیے نہیں ہوتے کہ..."

"اگر خدا گنجے کو ناخون دے دے تو وہ کھجلا کھجلا کر مر جائے۔" پیچھے سے چٹرجی بیچ میں بول پڑا اور سارا کینٹین بلند اور مشترک قہقہوں سے گونج اٹھا۔

روپ اور چٹرجی دیر سے آئے پیچھے کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے، لیکن وہ لوگ اس بحث میں اس قدر منہمک تھے کہ کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا نہ کسی کو ان کے آنے کی خبر ہوئی۔ اس غیر متوقع مداخلت سے ہنگی کا موڈ بگڑ گیا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا پھٹے میں ٹانگ گھسیڑنے کے لیے۔" وہ ٹیڑھا سا منہ بنا کر بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ پھٹا ہے۔" چٹرجی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور دوبارہ قہقہے در و دیوار سے ٹکرانے لگے۔

"میجر آ رہا ہے۔" کاؤنٹر سے حوالدار دبے لہجے میں چیخا اور سب کی سٹی گم ہو گئی۔

میجر فرہاد اپنے بھاری فوجی بوٹ پہنے، موٹی سی پالش دار بید بغل میں دبائے ایک ہاتھ سے مونچھ پر تاؤ دیتا ہوا ایک نظر ادھر ڈالتا ہوا کینٹین کے قریب سے گزر گیا۔ اور اس کے وزنی

Akram Allahabadi

قدموں کی آہٹ دور تک سنائی دیتی رہی۔

وہ شاید ان کے قہقہے محض اپنی رعب دار شخصیت بلکہ عہدے کے خاموش اثرات سے ختم کرنے کے لیے ہی ادھر سے گزرا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سب اپنے اپنے کوبنوں سے مل چکا کر چلے گئے اور ان کی جگہ دوسرے آ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

آج کی گفتگو کے بعد اس موت کے شہر اور چٹر جی کے نزدیک روپ کی وہمی تخلیق اسی عجیب روح کے بارے میں چٹر جی نے پھر اس سے کچھ نہ کہا، لیکن وہ اپنے خیمے میں آ کر بڑی سنجیدگی سے روپ کے مستقبل پر غور کرتا رہا۔ اسے روپ سے محبت تھی۔ بچپن کا اکیلا وفادار ساتھی اس کے دل سے بہت قریب تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ روپ کس قدر خطرناک جنون سے کھیل رہا ہے۔ اور اگر یہ تاثرات اور گہرے ہوتے گئے تو ایک دن وہ اپنی زندگی ضرور تباہ کر لے گا۔ اس لیے وہ روپ کو کسی بھی طرح اس پاگل پن سے روکنا چاہتا تھا جس کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ آ رہی تھی۔ روپ کس قدر ضدی ہے یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ سمجھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ صرف ایک ہی طریقہ تھا بشرطیکہ کیمپ کمانڈر اس کی بات مان لے۔ اپنی اس کوشش کو آزمانے کے لیے آخر وہ غروب آفتاب کے بعد ہی کیمپ کمانڈر میجر فرہاد کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے چوڑے خیمے میں وردی اتارے ایک فولڈنگ آرام کرسی پر نیم دراز کتاب پڑھ رہے تھے۔ چٹر جی کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے انھوں نے اسے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے، چٹر جی؟" انھوں نے بزرگانہ شفقت سے پوچھا۔

"جی میں یہ کہنے آیا تھا کہ کیا بہتر نہ ہوگا جو ہمیں اب کسی اور کیمپ میں کام کرنے کا

Akram Allahabadi

موقع دیا جائے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ کیا میرے یہاں تم لوگوں کو کوئی تکلیف ہے؟" بڑی نرمی سے میجر فرہاد نے پوچھا۔

"جی نہیں، بلکہ ہم تو آپ کے مداح ہیں کہ آپ نے ہم سے بالکل بزرگوں جیسا سلوک کیا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ صرف کام کرنے آئے ہیں اور ان قریبی علاقوں میں ہمارا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔"

"اوہ سمجھا۔ بھئی واقعی تم لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی میں بڑے دیانت دار رہو۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا بھی خدمتِ خلق کا اس قدر جذبہ رکھتے ہیں۔" میجر فرہاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ سے کم۔ آپ لوگ تو ملک اور قوم کے لیے ہر وقت سر بہ کفن رہتے ہیں۔" چٹرجی عقیدت سے بول اٹھا۔

"تم لوگ واقعی بہت اچھے لڑکے ہو۔ کاش میری ایسی بہت سی اولادیں ہوتیں جیسے تم لوگ ہو۔" فرہاد خان نے محبت اور بزرگی کے ملے جلے احساس سے کہا۔

"ہم بھی تو بچے ہیں آپ کے۔" چٹرجی نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"خوب، خوب، یہ بھی ٹھیک ہے۔" فرہاد خان کھل پڑے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولے۔ "اچھا، میں کل ہی تم لوگوں کا ٹرانسفر کالاچوکی کیمپ کیے دیتا ہوں، ادھر ابھی تک امدادی رضا کاروں کی کمی ہے۔" میجر فرہاد نے کہا۔

"بہت خوب۔" چٹرجی نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میجر نے خود اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن صبح ۱۰ بجے جب ان رضا کاروں کو کالاچوکی کے کیمپ کے تبادلے کا حکم ملا تو کچھ کو حیرت ہوئی، لیکن چٹرجی نے خود ہی انھیں اس کا سبب بتا دیا اور وہ گھنٹہ بھر بعد ہی روانگی کی تیاریاں کرنے لگے۔ روپ کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ چٹرجی ایسا کیوں کر رہا ہے، لیکن اس نے ان لوگوں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود میجر فرہاد کے پاس پہنچ گیا اور یہ بہانہ کر کے کہ ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں کل پرسوں چلا جاؤں گا۔ اس سے اپنے ٹھہرنے کی اجازت لے آیا۔ میجر فرہاد کو تو اصل وجہ معلوم نہ تھی، نہ ہی چٹرجی روپ کے کیے ہوئے وعدے کے مطابق کسی اور کو اس بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

وعدے کے علاوہ بھی وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ لوگ روپ کو پاگل یا وہمی جیسے ناموں سے یاد کرنے لگیں۔ اس لیے اس نے ہر بات کو صرف اپنے تک محدود رکھا تھا یا روپ کے پتا تک جنھیں مجبور ہو کر اس نے چھٹی لکھ دی تھی۔

۱۱ بجے تک ایک ٹرک میں اپنے سامان سمیت یہ رضا کار کالاچوکی کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے اور روپ وہیں رہ گیا۔ چٹرجی کے اب بس کی بات نہ تھی کہ خود بھی اس کی خاطر ٹھہر سکتا، کیونکہ اس نے ہی میجر فرہاد سے تبادلے کی اجازت لی تھی اور پھر وہ اس پارٹی کا لیڈر تھا، اس کا ساتھ جانا ضروری تھا۔

☆☆☆☆☆☆

تمر ساتھی رضا کاروں کو کالاچوکی کیمپ پر چھوڑ کر اور ان کی پوسٹنگ اور قیام کا انتظام کرا کے دو گھنٹے بعد ہی وہ اس ٹرک پر لوٹ آیا۔ واپسی پر وہ سیدھا روپ کے خیمے میں گھس گیا، مگر وہ وہاں نہ تھا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ 'ضرور وہیں گیا ہوگا'۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ باہر دوسری طرف فوجی چوکیدار آ رہا تھا۔ اس سے چٹرجی نے پوچھا، مگر اس نے گردن ہلاتے ہوئے

کہہ دیا۔

"آج میں نے غور نہیں کیا، میں تو سمجھا تھا وہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی گئے ہوں گے۔"

چتر جی اسے کوئی دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا کیمپ کی حد سے نکل کر خشک نالے کو پار کرتے ہوئے موت کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

پہاڑوں کے دامن میں موت کا شہر حدِ نظر تک اپنے شکستہ بازو پھیلائے اسی طرح ویران اور اداس سو رہا تھا۔ وہ ان ہی ناہموار راستوں سے گزرتا ہوا دوپہر کی تیز دھوپ میں بار بار چہرے کا پسینہ پونچھتا جب اس ٹیلے پر پہنچا تو آپ ہی آپ اس پر ایک طرح کا خوف طاری ہو گیا۔ روپ کی بتائی ہوئی باتوں کا ہلکا سا تصور ایک آسیبی خاکے کی طرح اس کی نگاہوں میں رقص کرنے لگا۔ وہ روح اور یہ کھنڈر نہ جانے کیوں اس کے قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ آوارہ ہواؤں کے جھونکے کھنڈروں کے شکستہ در و دیوار کے شگافوں سے سنسناتے گزر رہے تھے۔ ان کی ملی جلی سیٹیاں ایک پر ہول لاہوتی موسیقی کا سا اثر پیدا کر رہی تھیں۔

وہ ڈرتے ڈرتے آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کھنڈر کے ورانڈے کے نزدیک پہنچا اور داہنے طرف پڑے ہوئے ملبے کے ڈھیر پر گری ہوئی سیال کی آڑ سے اندر کی طرف جھانکنے لگا۔ فضا کسی پرانے قبرستان کی طرح خاموش تھی۔ یکا یک وہ چونک پڑا۔ اندر سے اسے کچھ آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی کسی سے باتیں کر رہا ہوں۔ ان میں سے ایک آواز روپ کی تھی جس سے اس کے کان اچھی طرح آشنا تھے۔ دوسری آواز کھرے سکے کی نقرئی کھنکھناہٹ کی طرح باریک اور سریلی تھی۔ جیسے ہوا ستار کے تاروں پر رقص کرے۔

چتر جی کا دل اندر سے دھڑکنے لگا۔ اگر روپ کے کہے پر یقین نہ کیا جائے تو یہ دوسری آواز کس کی ہے؟ کیا اسی روح کی؟ یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پیر تک لرز گیا۔

"لیکن ہو سکتا ہے کوئی اور ہو۔" اس نے پھر اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔

Akram Allahabadi

اس طرف سے اندر کے دالان کا منظر صاف نظر نہ آرہا تھا، اس لیے وہ آہستہ سے اٹھا اور برآمدے کے سرے سے کتراتا ہوا اس کونے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ نیم شکستہ چھوٹی سی تاریک کوٹھری کی باہری دیوار شروع ہوئی تھی۔ اندر کی چیزیں یہاں سے صاف نظر آسکتی تھیں۔

وہ ایک دم تھرّا اٹھا۔ وہی روح، بالکل وہی لڑکی جسے اس دن چتا میں ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے جلایا تھا روپ کے سامنے کچھ دور بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے خوبصورت لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔ 'تو روپ سچ کہتا تھا۔ اوشا کی روح اس سے روز ملنے آتی ہے، اسی کھنڈر میں'۔

'اوشا کی روح، وہ مردہ لڑکی؟' حیرت وخوف کے ملے جلے لہجے میں اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ توہم پرست نہ تھا، لیکن جب اس مردہ لڑکی کی روح ایک حقیقت کی طرح نگاہوں کے سامنے متحرک اور بولتی نظر آئی تو اس کے حواس بجا نہ رہے۔ مشکل سے اس نے اپنی چیخ روکی۔ وہ خوفزدہ اور لرزاں سا تھا۔ کسی طرح برآمدے سے نکل کر ٹیلے سے اترتا ہوا کیمپ کی طرف اتنی تیز واپس بھاگا کہ وہ ایک جگہ تو ٹھوکریں کھا کر گرتے گرتے بچا۔ وقتی طور پر ایک روح کو دیکھ لینے کی ہیبت اس پر اس بری طرح طاری ہو چکی تھی کہ کیمپ میں پہنچ کر بھی دیر تک اس کا دل دھڑکتا رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس پر اس کی آسیبیت نہ مسلط ہو جائے۔ لیکن کچھ ہوا نہیں۔ کافی دیر بعد اس کے دل ودماغ کو سکون حاصل ہوا، لیکن وہ کسی سے کچھ بولا نہیں۔ اوّل تو بنا اپنی آنکھوں دیکھے کوئی اس فریبے پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا اور پھر اس طرح وہ اور روپ دونوں پاگل یا آسیب زدہ سمجھے جاتے۔

وہ روپ کے ہی خیمے میں اس کے اسٹریچر پر لیٹا ہوا پڑا سوچتا رہا۔ باہر کیمپ کے بیچ کی سڑک نما روش پر فوجی چوکیدار کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ تین بجے کے قریب روپ ہشاش بشاش خیمے میں داخل ہوا تو چٹرجی کی آنکھ لگ چکی تھی۔ پہلے روپ سوچ میں پڑ گیا، لیکن پھر کچھ نہ سمجھ کر وہ پاس پڑی ہوئی فولڈنگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ 'شاید مجھے ساتھ لے

چلنے کی کوشش کرنے پھر سے آیا ہو' وہ سوچنے لگا۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی سوتے ہوئے چٹرجی کے بے ریا اور سادہ سے چہرے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ 'کتنا بھولا ہے میرا دوست۔ وہ نہیں سمجھتا کہ میں اس وقت زندگی کے حسین ترین لمحوں سے گزر رہا ہوں۔' وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور پھر تھکی ہوئی ٹانگیں آگے کی طرف پھیلا کر وہ ہوا کے جھونکوں سے بار بار ادھر ادھر اڑنے والے دروازے کے پردے کے بیچ سے دور ہلکے نیلے اور روشن آسمان کی تہ میں ان خلاؤں کو گھورنے لگا جہاں پہاڑوں کے دھندلے دھندلے نقوش فاصلے کے دھندلکے میں ڈوبے معلوم دے رہے تھے۔ پھر ایک بار اسے کھانسی آ گئی اور چٹرجی نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"تم...؟" وہ اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"ہاں، کیوں؟" روپ کو اس کی حیرت پر حیرت ہونے لگی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں، میں تو تمہیں لینے آیا تھا۔" وہ فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"مگر میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں جا سکتا۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں مجبور ہوں۔ چٹرجی، ایشور کے لیے مجھے زندگی کے ایک مسلسل بے سکون دور کے بعد میسر ہونے والی خوشیوں سے محروم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میری دنیا میں پھر کچھ نہ رہ جائے گا۔" روپ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

چٹرجی لاجواب سا ہو گیا۔ وہ اسے یہ بھی تو نہ بتا سکتا تھا کہ آج وہ خود بھی اپنی آنکھوں سے اس آسیبی منظر کو دیکھ کر آیا ہے۔ بتا دیتا تو روپ کے دل سے شاید ہمیشہ کے لیے اس کا اعتبار اٹھ جاتا۔

"برا نہ ماننا دوست۔ زندگی میں یہی ایک موقع ہے جب میں تمہاری بات ٹال رہا ہوں، کیونکہ یہ میری موت و زندگی کا سوال ہے۔" روپ نے اس کا ہاتھ دبا کر پھر اسے سمجھایا۔

"نہیں، برا کیوں مانوں گا، ایسی کیا بات ہے۔" چٹر جی نے لہجہ بدل دیا۔ لیکن جیسے روپ کو چھوتے ہوئے بھی اسے ایک قسم کا خوف سا محسوس ہونے لگا ہو۔ وہی روپ جسے وہ اس روح کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے وہ خود دیکھ کر آیا تھا۔

"اچھا اب چلتا ہوں۔ ٹرک واپس آ رہا تھا اس لیے آگیا تھا تمہارے پاس۔" چٹر جی نے پھر کہا۔

"تو کیا پھر نہ آؤ گے؟" روپ نے مسکرا کر پوچھا۔

"آؤں گا کیوں نہیں، سویرے نہ سہی، شام کو تو آتا ہی رہوں گا۔ مگر تم اس طرح یہاں کب تک ٹھہرو گے؟" چٹر جی نے اسٹریچر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں جانتا، مگر تم سے کچھ ایسا دور بھی تو نہیں ہوں۔" روپ بولا۔

"خیر۔" چٹر جی خاموش سا ہو گیا۔ وہ اداس نظر آ رہا تھا۔

"کم از کم چائے تو میرے ساتھ پیتے جاؤ۔" روپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور چٹر جی چپ چاپ اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ دونوں کینٹین میں چلے گئے۔ یہاں اس وقت سناٹا تھا، سب کام پر گئے ہوئے تھے، صرف کینٹین کا حوالدار میجر کاؤنٹر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا، ان کی آوازیں سن کر جاگ اٹھا۔

چائے اس وقت تیار نہ تھی لیکن اس نے دس منٹ میں ہی تیار کرا دی۔ چٹر جی اس درمیان میں زیادہ نہ بولا، لیکن کوشش کرتا رہا کہ لہجہ خوشگوار رہے۔ اس کے برعکس روپ خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد چٹر جی شام کو یا دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور روپ خود کچھ مسکراتا، کچھ سوچتا اپنے خیمے میں لوٹ آیا۔

☆☆☆☆☆☆

کالا چوکی کیمپ نمبر ۲ میں واپس پہنچ کر چٹرجی نے ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کیوں گیا تھا، لیکن اس کے چہرے سے اب بھی اداسی اور تھکن سی برس رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق معلوم ہوتا تھا۔ کسی کی باتیں سنتا، سنتے سنتے کچھ نہ سنتا اور جب چونکتا تو منہ کھول کر 'آں' کر کے رہ جاتا۔ رمیش سے نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے چٹرجی، بڑے بجھے بجھے نظر آ رہے ہو؟"

"دست آ رہے ہوں گے۔" ہنگلی ناتھ رمیش کی کھانے کی میز کے دوسرے سرے سے بول اٹھا۔

جواب میں چٹرجی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

"یار معاملہ کچھ ایسا ویسا معلوم ہوتا ہے۔" ہنگلی نے چٹرجی کا موڈ سمجھتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

"کیا بات ہے، بھیا چٹرجی؟" وہ اس طرح پوچھنے لگا جیسے بڑے بوڑھے بچوں کو چمکار کر ان کی کسی ضد کا سبب پوچھتے ہیں۔

"ارے کیوں پریشان کر رہا ہے بھائی تو ایک شریف آدمی کو، کیا آج مغز کھانے کو اور کوئی نہیں ملا؟" پیچھے سے آ کر بوس نے ٹانگ اڑا دی۔

"اے بوس، تو میری جائداد کا آدھا حصے دار ہے کیا جو ہر جگہ ہر بات میں ٹانگ گھسیڑ دیتا ہے۔" ہنگلی نے کسی قدر تیز ہو کر بوس کو ڈانٹا۔

"برخوردار، یہ رعب کسی اور کو دکھانا، چلو اپنی جگہ بیٹھو۔" بوس جیسے آج اس سے لڑنے کے لیے پہلے ہی سے ورزش وغیرہ کر کے آیا تھا۔

"بھئی میرا دماغ اس وقت پریشان ہے۔ میری کھوپڑی پر مرغوں کی طرح مت

Akram Allahabadi

لڑو۔" چٹرجی جھنجلا کر بول اٹھا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" بوس نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔

"یہ آئے بڑے وہاں سے رستم کے دادا بن کر۔" ہنگلی کسی بد دماغ بچے کی طرح برا سامنہ بنا کر بڑبڑاتا ہوا اس جگہ سے اٹھ گیا۔ "میری حکومت ہوتی تو ایسے گدھوں کو سولی پر چڑھوا دیتا۔" یہ کہتا ہوا وہ اپنی پہلی جگہ پر آ بیٹھا۔

"خدا گنجے کو ناخن ہی نہیں دیتا۔" بوس نے اپنی جگہ سے مسکرا کر جواب دیا، لیکن چٹرجی انھیں لڑتا چھوڑ کر اٹھ کر چلا آیا، جہاں اس کا خیمہ بھی علیحدہ نصب تھا۔

مغرب ہوتے کیمپ کا ایک فوجی رضا کار دوسرے خیموں کی طرح اس کے خیمے میں بھی ایک جلتی لالٹین لٹکا کر چلا گیا۔

کھانا وغیرہ کھا چکنے کے بعد جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تو اس کا بوجھل دماغ پہلے کے بہ نسبت کافی پرسکون ہو چکا تھا اور اس روح کی دہشت اس کے ذہن سے زائل ہو گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا، 'آخر میں اتنا خوفزدہ کیوں ہو گیا۔ روحیں اور کچھ تو نہیں بگاڑ سکتیں، سوائے آسیب زدہ کرنے کے۔ لیکن کچھ بھی ہو روپ کو کسی طرح بھی اس سے بچانا ہی ہوگا، ورنہ نہ جانے اس کا کیا ہو۔' اور وہ گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

دل نے کہا، 'شاید کوئی بڑی قربانی دینی پڑے گی'۔ دوستی بولی، 'یہی تو امتحان ہے'۔

'مگر بچاؤں کیسے' وہ اس کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ چاچا جی کو بلا لیا جائے تب بھی نہ جانے روپ اس وقت تک کس حال میں پہنچ جائے۔

ممکن ہے کچھ اور کر بیٹھے۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور پھر ایک بار وہ روپ کی تمام باتوں پر غور کرنے لگا۔ آج سے پہلے اس نے روپ کی باتوں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ اس روح کو محض روپ کے وہم زدہ دماغ کی تخلیق سمجھتا تھا، لیکن آج تو وہ خود اس روح کو اس سے باتیں کرتے دیکھ کر اس کو بولتا سن کر آیا تھا۔ پھر یقیناً روپ نے جو

Akram Allahabadi

کچھ کہا تھا وہ اس کی خود اختراعی الفاظ نہ تھے۔

پھر وہ سوچنے لگا کوئی ایسی صورت کہ وہ روح اس سے دور ہو جائے۔ اور اچانک اسے روپ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے اپنی اس روح سے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہے تھے کہ 'جس دن ہمیں کوئی تیسرا دیکھ لے گا، شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔ وہ پھر نہ آ سکے گی۔

وہ ایک دم اچھل پڑا۔ یہی ایک صورت ہے اس بھیانک سلسلے کو ختم کرنے کی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہیں اس کی اس حرکت کا ردِ عمل کچھ خود اسی پر نہ ہو۔ اور ایک بار پھر وہ اس روح کے خوف سے متاثر ہونے لگا۔ دوستی قربانی چاہتی ہے۔ وہ ہمت کر کے اپنے آپ سے بولا۔

'خواہ انجام کچھ بھی ہو، روپ کو بچانا ہی ہوگا، چاہے خود تم پر ہی مصیبت کیوں نہ آ جائے'۔ اور پھر اس نے ہوا میں ہاتھ کا گھونسا لہراتے ہوئے اپنے عزم بالجزم کا خیالی مظاہرہ کیا۔

"میں اسے بچاؤں گا۔ میں اسے اس آسیبت کی موت نہ مرنے دوں گا۔" اس نے آخری فیصلہ کر لیا۔ ایک خطرناک اور انجانے انجام کا حامل فیصلہ۔ پھر وہ سب کچھ دوسرے دن پر چھوڑ کر سو گیا۔

آج صبح سے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل لہرائے ہوئے تھے۔ ہوا کچھ خنک سی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑیوں کے مغربی سلسلے کے دامن میں کہیں قریب ہی بارش ہوئی ہے۔ سورج کبھی صاف روشن ہو جاتا، کبھی سفید سفید روئی کے گالوں کی آڑ لے لیتا۔

روپ آج بھی کل کی طرح مسرور اور مطمئن نظر آ رہا تھا، لیکن اسے یہ ڈر ضرور تھا کہ وہ اس طرح روبصحت ہو کر اس کیمپ میں اور نہ ٹھہر سکے گا، اس لیے اس نے کیمپ سے ایک ڈیڑھ میل دور شیام گڑھ کے راستے میں بنی ہوئی قبائلیوں کی جھونپڑیوں میں سے اسی بوڑھے کی جھونپڑی اپنے عارضی قیام کے لیے منتخب کر لی تھی، جس کی ایک دن اس نے مدد کی تھی۔ وہ

Akram Allahabadi

بوڑھا قبائلی اس کا بہت مشکور تھا۔ اور جب اسے معلوم ہوا شہر کا یہ خوش حال نوجوان بابو اس کی جھونپڑی میں آ کر ٹھہرنا چاہتا ہے تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ کم از کم اسے روٹی کا تو سہارا مل جائے گا۔ مگر اس دن بھی کیمپ کمانڈر کی طرف سے اسے کوئی حکم نہیں آیا، نہ کوئی باز پرس کی گئی۔ شاید میجر فرہاد غیر فوجی رضا کاروں کے لیے تنظیم کی سختی سے کام نہ لیتے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ طبیعت درست ہو جانے پر وہ خود ہی کام پر چلا جائے گا۔

البتہ وہ فوجی چوکیدار روز برابر اسے آتے جاتے غور سے دیکھتا رہتا، کیونکہ روپ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی ہدایت اسے چٹر جی نے کر رکھی تھی۔

سورج مشرقی کناروں سے بتدریج دور ہوتے ہوئے درختوں کے سائے چھوٹے کر چکا تھا، تب وہ صبح کے کھانے کے لیے میس میں پہنچا۔

جب سے اس کے ساتھی رضا کار کالاچو کی کیمپ چلے گئے تھے، وہ فوجی رضا کاروں کے ساتھ میس میں ہی کھانا کھاتا تھا۔ اسے ان دوسرے رضا کاروں کے سامنے جاتے ہوئے اس طرح ایک قسم کی شرمندگی سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی اس اخلاقی کمزوری کو محسوس کر رہا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ اور اس کے ساتھی آسام آئے تھے وہ اس کی بجا آوری سے پہلوتہی کر رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کاہل یا بد دماغ یا کام چور تھا، بلکہ محض اس مجبوری کی خاطر جو بری طرح اس کی زندگی اچانک ایک ایسی راہ پر چل پڑی تھی جس کا دوسرا سرا نہ ملتا تھا۔ مگر اس پر چلنے کے لیے مجبور تھا اور محبت کے آگے دنیا کے طاقتور سے طاقتور انسان بھی جھک جاتے ہیں، وہ تو ایک حساس دل رکھنے والا نوجوان طالب علم تھا۔

میس سے کھانا کھا کر لوٹا تو ۱۰ بج رہے تھے۔ رضا کاروں کے چلے جانے کے باوجود وہ وقت گزاری کے لیے دیر تک وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ہوتی ہی اتنی کٹھن ہیں کہ مشکل سے بتائی جاتی ہیں۔ نہ جانے کس طرح شام ہوتی تھی اور پھر صبح اور پھر صبح کے بعد دوپہر تک کا وقت گزارنا اسے دوبھر ہو جاتا تھا۔ خیمے میں واپس لوٹ کر وہ اسٹریچر پر نیم دراز ہو

Akram Allahabadi

کرشیگور کی ایک ناول کے اوراق الٹنے لگا۔ رضا کاروں کے کام پر چلے جانے سے باہر سناٹا ہوگیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے ۱۱ بجے وہ کیمپ سے نکلا اور ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ فوجی چوکیدار اسے راہ میں ملا، لیکن نہ اس نے کچھ پوچھا، نہ روپ نے کچھ کہا۔ البتہ اس کے چلے جانے کے بعد چوکیدار دیر تک کھڑا اسے پیچھے سے گھورتا رہا۔ پھر کچھ نہ سمجھ کر بے معنی انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے وہ کیمپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گشت کرنے میں مصروف ہوگیا۔ روپ پہلے تو سیدھا کیمپ کو آنے والی کچی سڑک پر چلتا رہا اور جب چوکیدار اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ سڑک سے اتر کر خشک نالے کو عبور کرتا ہوا موت کے شہر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆☆

سنسان اور ویران کھنڈروں کو عبور کرتا ہوا جب وہ اس ٹیلے کے نزدیک پہنچا تو ابھی بارہ بجنے میں ۵ منٹ باقی تھے۔ آج وہ معمول سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ جب وہ اس کھنڈر میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ بیقرار سا کھنڈر میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور دماغ نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ وارنڈے سے باہر نکل کر اس نے ایک دبی سی انگڑائی لی اور پھر اس پتھر کی چٹان پر آ کر بیٹھ گیا جہاں سے اس کی زندگی کے اس عجیب وغریب دور کا آغاز ہوا تھا۔ وہ چٹان جو اس کے اس آسیبی افسانے کا عنوان تھی۔ جس نے اسے عالمِ لاہوت کی ایک ایسی خوبصورت روح سے مربوط کرا دیا تھا جو اس کے احساسات کے ہر گوشے میں پھیل گئی تھی۔ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا سورج کا منہ چومتا ہوا گزر گیا۔ سائے ایک بار ہلکے ہو کر پھر گہرے ہوگئے۔ دور کے مناظر کبھی روشن اور کبھی دھندلے ہو جاتے۔ کھنڈروں کے شگافوں سے سائیں سائیں کرتی گزرنے والی ہوا میں کبھی بھیانک پن بسنے لگتا، کبھی رومان انگیز تاثر۔ درکی ہوئی زمین کی دراڑوں میں اٹکے ہوئے درخت ہوا کے تیز جھونکوں سے لرز لرز اٹھتے اور آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں تیرنے والی مردار خور چیلوں کے پروں کی

Akram Allahabadi

پھڑ پھڑاہٹ ماحول کے سکوت میں ایک خفیف سا شور پیدا کر کے معدوم ہو جاتی ۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا ہوا پھر اس کھنڈر میں گھس گیا ۔ مگر وہ بیٹھی ہوئی تھی ۔ وہ آ چکی تھی ۔ شاید ان آوارہ ہواؤں کے دوش پر جن میں سناٹے بہہ رہے تھے ۔ اسے یقین ہی تھا کہ وہ آ چکی ہوگی ۔ وہ اپنے وقت پر ضرور آتی تھی ۔ شاید وہ وقت جب روحیں آزاد چھوڑ دی جاتی ہیں ۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا اٹھی ۔ روپ اس کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا ۔

"شاید آج جلدی آ گئے تم ۔" وہ اس کی طرف ہنستی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی ۔

"تمہارے بغیر کہیں دل نہیں لگتا ۔ دوپہر سے شام اور شام سے صبح کرنا مصیبت ہو جاتا ہے ۔" روپ نے پیار بھری نظروں سے اس کے حسین چہرے کو تکتے ہوئے کہا ۔

"کیا بیٹھو گے نہیں ؟" اس نے کھنکتی آواز میں پوچھا ۔

"اوہ، لو یہ بیٹھ گیا ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے اسی پتھر پر اس سے ۵ قدم دور بیٹھ گیا ۔

دل سے اسے اس قدر قریب کر لینے کے باوجود کبھی اس کے زیادہ نزدیک نہیں گیا تھا ۔ وہ اسے اتنی ہی دور سے دیکھتے رہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے محض ہوا یا عکس نہ معلوم ہو ۔ حالانکہ وہ اسے بالکل مجسم اور مکمل سامنے نظر آتی تھی، متحرک، بولتی، ہنستی اور آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کو حرکت دیتی ہوئی ۔

"کیا تم نے انجام بھی سوچا ہے اس کا ؟" وہ اچانک سنجیدہ ہو کر پوچھ بیٹھی ۔

"کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ نہ جانے میری زندگی کہاں کھو جانے والی ہے، مگر میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا ۔"

"دل کہتا ہے اگر ڈوب جانا ہی میری منزل ہے تو ڈوب جا ۔" وہ جذبات سے متاثر لہجے میں بولا ۔

"اور اگر تمہیں واپس لے جایا گیا ؟" روح نے دوسرا سوال کیا ۔

Akram Allahabadi

"اب ناممکن ہے۔میں کسی قیمت پر اب تمہاری جدائی برداشت نہ کرسکوں گا۔میرا دل اب میرے بس میں بالکل نہیں رہا ہے۔کوئی طاقت اب مجھے تم سے چھین نہیں سکتی۔" اس نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی نگاہوں کو جذب کرتے ہوئے والہانہ انداز میں کہا۔

"کاش ایسا ہی ہو کہ تمہیں مجھ سے کوئی چھین نہ سکے۔" اوشا کی روح کے ان الفاظ میں ایک آرزو لچک رہی تھی۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟" روپ نے اس سے متاثر ہوکر پوچھا۔

"محبت اور اعتبار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔" وہ بولی۔

اچانک کسی کے دوڑتے قدموں کی کھڑبڑاہٹ سنائی دی۔دو چار پتھر لڑھکے۔وہ دونوں ایک دم چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔وہ چھڑ جی تھا۔

"روپ۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر چیخا۔اس کی سانس پھولی ہوئی سی تھی۔روپ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔وہ اور چھڑ جی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔اچانک روپ کو کچھ یاد آ گیا۔وہ چونک کر پلٹا۔مگر وہ...وہ تو وہاں نہ تھی۔

اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جس دن ہمیں کوئی تیسرا دیکھ لے گا تو ہم شاید پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔

"پھر کبھی نہ مل سکیں گے....ہم پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔" روپ اس دردانگیز اتفاق سے پیدا ہوجانے والی جذبات سے بپھر کر بڑبڑایا اور پھر کسی ہذیانی مریض کی طرح چیخ اٹھا۔

"چھڑ جی، یہ تم نے کیا کیا؟" چھڑ جی اس کی یہ کیفیت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔روپ اچانک تبدیل ہوگیا تھا۔جیسے ایک دم اس کے دل و دماغ پر موٹے موٹے وزنی چٹانیں لڑھک پڑی ہوں۔

اس کے چہرے کا رنگ زرد اور منہ فق ہو چکا تھا۔"یہ کیا کیا تم نے، چھڑ جی؟" وہ

Akram Allahabadi

انتہائی درد و اضطراب آلودہ وحشی آواز میں بولا۔

"میں نے؟ ہم... میں تمہیں اس طرح تباہ نہ ہونے دوں گا، روپ۔ میرے ساتھ واپس چلو۔" چٹرجی نے کسی قدر سہمے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"واپس چلو۔" یہ کہہ کر دانت پیستے ہوئے پاگل کی طرح روپ نے اس کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ مار دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ چٹرجی لڑکھڑا گیا۔

روپ کی یہ جنونی کیفیت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ خلافِ امید آج زندگی میں پہلی بار اس کی دوستی نے ایسا طمانچہ کھایا تھا۔ ایک ایسے دوست کے ہاتھ سے جس کی زندگی کو ایک تباہ کن آسیبیت کی گرفت سے بچانے کے لیے آج وہ اپنی پرواہ کیے بغیر ان کے درمیان کود پڑا تھا۔ اس دردانگیز احساس سے اس کے آنسو نکل آئے۔

"مجھے اپنا یہ انجام معلوم نہ تھا، روپ۔ میں نے تو تمہیں موت کے منہ سے بچانا چاہا تھا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بچانا چاہا تھا یا موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے ایسا کرنے کے بعد ہم کبھی نہ مل سکیں گے؟ وہ کبھی نہ آ سکے گی۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ یہ میری موت و زندگی کا مسئلہ ہے۔ تم... تم نے دوست کے پردے میں میرے بدترین دشمن نکلے، چٹرجی۔ تم نے مجھے جیتے جی تباہ کر دیا۔ وہ اب نہ آئے گی۔ میری دنیا اجڑ چکی ہے۔ وہ اب کبھی نہ آئے گی۔ وہ.. اب..."

اور وہ دونوں ہاتھوں سے چکراتا ہوا سر تھام کر وہیں ملبے کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امل پڑے تھے۔ وہ گم سم اس شگاف کی طرف ایک ٹک نظر جمائے دیکھتا رہا، جہاں پہنچ کر وہ معدوم ہو جایا کرتی تھی اور آنسوؤں کی دو دھاریں اس کی دونوں آنکھوں کی نچلی پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بہتی رہیں۔ دو منٹ تک وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح خاموش رہے، لیکن چٹرجی اس کی یہ کیفیت نہ دیکھ سکا۔ روپ میں اچانک اس قدر تغیر پیدا

Akram Allahabadi

ہو جائے گا، یہ اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہشاش بشاش روپ ذرا سی دیر میں نڈھال اور حواس باختہ سا معلوم ہونے لگا تھا۔ جیسے اچانک کسی راہ چلتے مسافر کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ جیسے کسی نے ہنستے پھول کی رگوں سے ایک دم خون کھینچ لیا ہو۔ اس کی اداسی پھیلتی ہوئی شام کی طرح گہری ہوتی گئی۔

چٹرجی مضطرب ہو کر بول اٹھا۔ ''مجھے معاف کر دو، روپ۔ میں نہ جانتا تھا کہ واقعی ایسی ٹریجڈی ہو جائے گی۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' روپ برس پڑا۔ ''تم سب کچھ جانتے تھے۔ تمہیں میں خود بتا چکا تھا اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' اور پھر وہ بیٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ''چٹرجی، تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ میری زندگی کی تمام خوشیاں لوٹ لیں تم نے۔ تمہیں کیا مل گیا، چٹرجی؟ مجھے برباد کر کے تمہیں کیا مل گیا؟ میں اب... اب میں کیا کروں گا۔ میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔'' وہ بچوں کی طرح پھوٹ کر رو پڑا اور چٹرجی کا دل لرز گیا۔ اس نے اس بچے کے ہاتھوں سے اس کا وہ کھلونا چھین لیا تھا جس میں خود اس کی روح سمائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ انجام کچھ بھی ہوتا، لیکن شاید اس نے اس طرح درمیان میں آ کر اچھا نہیں کیا۔ پھر بھی وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

''مجھے افسوس ہے، روپ۔ ایشور جانتا ہے کہ میں شرمندہ ہوں۔ میں نے تمہارا بھلا چاہا تھا وہ برا ہو گیا، لیکن بھگوان کے لیے اب یہاں سے چلے چلو۔ اس اجاڑ کھنڈروں والی بھیانک جگہ میں اب کچھ نہیں ہے۔ تم خود ہی کہہ چکے ہو وہ یہاں اب کبھی نہ آئے گی۔ چلے چلو، روپ۔ میرے اچھے دوست۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے سمجھانے لگا۔ اچانک روپ پاگلوں کی طرح بھڑک اٹھا۔ ''چلے جاؤ۔ میں اب کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں اس کا انتظار کروں گا۔

میں زندگی کے آخری سانس تک اس کا انتظار کروں گا۔تم جاؤ۔تم ایشور کے لیے چلے جاؤ۔'' وہ اپنے کندھوں سے چٹرجی کے ہاتھوں کو جھٹکے سے علیحدہ کرتے ہوئے متنفر اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اتنے جذباتی نہ بنو، روپ۔'' چٹرجی نے اسے اور سمجھانا چاہا، لیکن شدت غم کا اثر جنون میں تبدیل ہو کر اس پر بے طرح مسلط ہو چکا تھا۔اس نے دیوانوں کی طرح ایک وزنی پتھر ہاتھوں پر اٹھالیا اور بڑی زور سے چیخا۔

''چلے جاؤ چٹرجی، ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔''

اور جب وہ چیختا ہوا پتھر ہاتھوں میں اٹھائے آگے بڑھا تو چٹرجی موقع کی نزاکت کو دیکھ کر روپ کی اس جنونی کیفیت سے مایوس ہو کر خاموش سر جھکائے کھنڈر سے نکل گیا۔روپ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں چباتے ہوئے بھیگی بھیگی آنکھوں سے ورانڈے تک آکر دیکھا۔وہ چلا جا رہا تھا... دور... نڈھال اور مایوس... اداس اور ناکام ...ناہموار زمین پر کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح اس کے قدم لغزش کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

''بھگوان، یہ سب کیا ہو گیا۔اب کیا ہوگا۔'' وہ سر پکڑ کر پھر اسی ملبے کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔''اوشا، ایشور کے لیے صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔صرف ایک بار اور آجاؤ، ورنہ میں اس غم سے پاگل ہو جاؤں گا۔میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔'' وہ آپ ہی آپ آنسو بہاتے ہوئے اوشا کے تصور کو مخاطب کر کے بڑبڑانے لگا۔بھٹکتی ہواؤں میں اس کی رقت انگیز آواز ایک بھدے سے بے ترتیب دردناک راگ کی طرح تحلیل ہو کر دور تک موت کے شہر کے سناٹوں میں پھیل گئی۔مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔وہ تو جا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

شام ہونے لگی۔دن کے ڈوبتے ہوئے ڈوبتے بتدریج پھیلتے ہوئے اندھیرے

Akram Allahabadi

میں کھنڈروں کے اکیلے خاموش اور بے حس کھڑے ہوئے پتھر یلے لاشے اپنے مٹے مٹے سے منظر کے ساتھ اور بھیا نک ہو گئے۔ ہواؤں کی سنسناہٹ دن ڈھلے ہی ہو چکی تھی اور مٹیالے آسمان والی اس غمناک ماحول کی لامتناہی شام نے اس سنسناہٹ میں احساس کے تاروں کو مرتعش کر دینے والی ایک سنسنی خیز موسیقیت بھر دی تھی۔ جیسے اب اندھیرا ہوتے ہی اس شہرِ خموشاں میں گوشے گوشے سے آسیبیت ابھرنے لگے گی۔

مگر انتہا پر پہنچی ہوئی اس عجیب محبت کے جنون نے اس وقت روپ کے شعور سے وہ تمام کیفیتیں چھین لی تھیں جواب سے پہلے ایسے موقعوں پر اس پر خوف کو مسلط کر دیا کرتی تھیں۔ وہ اب تک کھنڈر میں اسی جگہ پتھر پر بیٹھا انہماک میں ڈوبی ہوئی گہری نظر سے پچھلی بڑے کمرے کی دیوار سے شگاف کر تک رہا تھا جہاں پہنچ کر اوشا کی روح نظروں سے غائب ہو جایا کرتی تھی۔

دو آنسو اس کی آنکھوں میں پھنسے ہوئے تھے اور وہ ڈھلک کر رخساروں پر نیچے کی طرف پھیل گئے تھے۔ وہ اب یہاں سے جا کر کرتا بھی کیا۔ اس کا سب کچھ تو یہیں لٹ گیا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اسے اس روح سے کتنی محبت ہے۔ وہ ہمیشہ سے شدید احساسات کا حامل رہا اور اس عجیب سی لاہوتی محبت نے تو اس کی شدتِ احساس کو جنون کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اب کچھ نہ چاہتا تھا، سوائے اوشا کی روح کے۔ زندگی میں یہ اس کی پہلی والہانہ محبت تھی جس میں سپردگی کا جذبہ اتنا نمایاں تھا کہ اس نے یہ جانے بوجھے بغیر کہ وہ کس سے محبت کر رہا ہے، وہ جو کوئی ٹھوس وجود نہیں، وہ جو نہ زندہ ہے، اس کے قریب ہو سکتی ہے، اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا تھا۔ خواہ اس کے لیے اسے اس مادی وجود کی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

مگر اس عروج تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی محبت چڑ جی کی وجہ سے اتنا گہرا زخم کھا گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اوشا کی روح کو کہاں ڈھونڈے۔ روحوں کا کوئی مقام نہیں، اور ہو تو کسے معلوم عالمِ بالا تک زندہ انسان کی پرواز تخیل بھی تو نہیں

جا سکتی کہ اپنی روٹھی ہوئی زندگی کو آواز دے سکے۔

مگر وہ یہاں سے جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ جگہ جہاں سے اس عجیب محبت کی داستان شروع ہو کر اچانک ختم ہو گئی تھی۔ مگر شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا دل جو امیدوں پر امکانات کی حد سے آگے تک یقین رکھنے کا عادی تھا، یہ تسلیم کرنا نہ چاہتا تھا کہ وہ اب نہیں آئے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے وہ اس کا یہیں اسی جگہ انتظار کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ عمر بھر یا اس گھڑی تک کہ اسی انتظار میں وہ اپنی آخری سانس بھی گنوا بیٹھے اور کوئی محبت کو بے وفائی کا الزام نہ دے سکے۔ تاریکی پھیلتی چلی گئی۔ کھنڈروں کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تمام موت کا شہر اپنی پرسکوت ویرانی کے ساتھ ان اندھیروں میں ڈوب گیا جو اب کئی گھنٹوں کے لیے دنیا پر حاوی ہو چکے تھے۔ گہرے نیلے، بلکہ سیاہ آسمان پر تارے ابھر آئے اور ہواؤں میں خنکی بہنے لگی، مگر وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

"آجاؤ آشا، دیکھو میں تمام دنیا کو چھوڑ کر ان ویران کھنڈروں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ایشور کے لیے آجاؤ۔" وہ بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر بڑبڑایا اور ہوا کا ایک جھونکا اس کے کانوں سے ٹکرا کر کچھ گنگناتا ہوا نکل گیا، جیسے وہ بھی کسی کی جستجو میں بھٹکتا پھر رہا ہو۔

اندھیری رات کا مہمان وہ الو بھی ٹوٹے کمرے کی شکستہ دیوار پر آ بیٹھا تھا جو اسے پہلے دن دن کی تاریکی میں ملا تھا۔ وہ اسے اپنی گول گول چمکتی آنکھوں سے گھورتے ہوئے چیخنے لگا۔ "چور... چور..."

دور کہیں کسی کھنڈر سے رات کے چوکیدار گیدڑ کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہے؟" اور بجھڑی کی کسی زمین گرفتہ جھاڑی سے اندھیرے میں ایک تیتر بولا۔ "یہ رہا... یہ رہا..."

روپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے سارا موت کا شہر جاگ رہا ہے، جیسے اس کے چاروں طرف آوارہ روحیں طرح طرح کے سوانگ بھرے اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس کے متعلق باتیں

Akram Allahabadi

کر رہی ہیں اور اسی وقت اچانک ایک چوڑے پروں والی چمگادڑ اپنے پر پھڑ پھڑاتی اس کے سر پر سے گزر گئی۔ وہ سر سے پیر تک لرز گیا۔ اس وقت وہ روحوں کی بستی میں تھا۔ روحیں جو سب کچھ کر سکتی ہیں، روحیں جو اوشا کی طرح نرم و نازک اور خوبصورت بھی ہوتی ہیں اور کسی سیاہ بدشکل عفریت کی طرح بھیانک بھی۔ رفتہ رفتہ ماحول کا تاثر اس پر اثر انداز ہونے لگا۔ مگر اب اس میں یہاں سے کھسکنے کی ہمت نہ تھی۔ اس تاریک اور کھنڈروں کے بے ترتیب، ناہموار سلسلے میں ایک قدم زندگی کی طرف بڑھانا خود ایک موت تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سنسنی پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ یہ رات اس کی زندگی میں ایک طلسمی خواب کی طرح بھیانک تھی۔ اتنی بھیانک کہ جس کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ اس کے ارد گرد دور دور تک کہیں زندگی کے خفیف سے آثار بھی نہ تھے، سوائے سنگ و گل اور خس و خاشاک کے ان ڈھیروں کے جن میں ہزاروں زندہ جسم بہت دن پہلے اچانک دب کر مر گئے تھے اور ان کی بھٹکتی روحیں ان ویرانوں میں کہیں نہ کہیں ٹہل رہی ہوں گی۔ پھر ایک بار وہ سر سے پیر تک زرد پڑ گیا۔ اس نے دیکھا پچھلے بڑے کمرے کی طرف سے اس اندھیرے سے ایک دراز قد سایہ ابھرا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

"بھگوان۔" کانپ کر اس کے دانت بج اٹھے۔

لیکن فوراً بعد ہی اسے احساس ہوا کہ کہیں یہ اس کا وہم تو نہیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے جیب سے ماچس نکال کر جلائی، لیکن روشنی میں صرف پرانے کمرے کی شکستہ دیوار کے ٹمیالے سائے لرز رہے تھے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"شاید تم نہ آؤ گی اوشا، اور یہ بھیانک رات یوں ہی گزر جائے گی۔"

رات اسی طرح آدھی گزر چکی تھی اور اب مشرق میں کھڑے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے کے گہرے کالے سائے کی اوٹ سے چاند ایک بڑے سرخ طباق کی طرح ابھرنے لگا اور باہر ہلکی ہلکی زرد روشنی کی کرنیں کھنڈروں کے سروں پر لرزنے لگیں۔

Akram Allahabadi

چاند کے اوراو نچے اٹھتے ،ایک تڑپتی ہوئی کرن شکستہ چھت کے مشرقی شگاف سے گزر کر اس کی آنکھوں پر پڑی۔ کتنی رومان آفریں تھی اس کی یہ ٹھنڈی روشنی میں نہائی ہوئی چاندنی رات میں اسی کھنڈر میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''کاش وہ آج بھی...'' ایک ٹھنڈی لمبی سانس کے ساتھ اس کی یہ آرزو لبوں سے نکلتے نکلتے بھینچ کر رہ گئی۔

بیٹھے بیٹھے وہ پھر ایک دم چونک پڑا۔ یہ کھڑ کھڑاہٹ؟ اور اس نے کھنڈر کے مشرقی شگافوں سے چھن کر آتی ہوئی چاند کی روشنی میں دیکھا، وہی سیاہ بلی، وہ اس بڑے اندرونی کمرے سے نکل کر اس کے سامنے سے گزری۔ اس کی زرد آنکھوں میں وحشتناک چمک تھی۔

''اوشا...'' وہ چونکا۔ اور ایک بار پھر اس کے وہم میں اوشا کا تصور اس سیاہ بلی کی شکل میں ابھرا۔ پہلے دن بھی وہ شاید اسی روپ میں اس کھنڈر میں داخل ہوئی تھی۔ اسے تقریباً ہر بار یہ بلی اسی کھنڈر میں ملی تھی۔

''ضرور وہ...'' اور دیوانوں کی طرح 'اوشا' چیختا ہوا وہ اس بلی پر جھپٹ پڑا۔ کالی بلی گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہوا رانڈے سے باہر نکل گیا، لیکن اتنی دیر میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کی جذباتی کیفیت اس پاگل جیسی ہو رہی تھی جو کچھ نہ چاہتا ہو اور سب کچھ چاہتا ہو۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر وہ وہیں نکھری ہوئی چاندنی میں اس کھنڈر کے سامنے والی چٹان پر بیٹھ گیا۔

بھیگتی رات کی خنکی سے جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ اپنی دھن میں کھویا ہوا آسمان پر بہتے چاند کو تکتا رہا۔ پھر آپ سے آپ اس کے کانوں میں وہی آدھی رات کے خواب والی لاہوتی موسیقی کی گونج بھرنے لگی۔ مدھم مدھم بھیانک مگر سریلی۔ وہ اس رات والے خواب کے تصور میں ڈوبتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں مُندھ سی گئیں اور ہوا کی لہروں میں تیرنے والی اس آفاقی موسیقیت کی تھاپ پر جیسے آہستہ خرامی کرتی وہ چلی آ رہی تھی۔ اسی لہراتے

Akram Allahabadi

ہوئے مخصوص سفید لباس میں لپٹی ہوئی ۔خوابوں کی دنیا کی حسین ساحرہ، روحوں کی بستی کی خوبصورت تمثیل ۔وہ نیم وا آنکھوں سے دیکھتا رہا۔وہ آہستہ آہستہ اس کھنڈر کی طرف بڑھتی رہی۔

ٹیلے کے نیچے سے ہی کسی بھیڑیے کی غراہٹ کی آواز نے اسے اچانک چونکا دیا اور جب اس نے پھیلی آنکھوں سے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔نہ روح نہ وہ لاہوتی موسیقی ،صرف ہواؤں کی سنسناہٹ تھی اور زرد زرد چاندنی میں دور تک پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے اس موت کے شہر کا بھیانک سناٹا ۔وہ لرز گیا۔

ٹیلے سے نیچے کوئی پہاڑی بھیڑیا کسی جنگلی خرگوش کے پیچھے دوڑا جارہا تھا۔پھر چاند بادل کے ایک لمبے ٹکڑے کی اوٹ میں چلا گیا اور موت کے شہر کے آثار مدھم پڑ گئے ۔اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس دنیا سے اس پار کہیں کالی روحوں کے بے ہنگم رقص پر بھاری ڈرم بج رہے تھے ۔مدھم مدھم، تیز تیز، یا شاید وہ کسی دور افتادہ قبائلی علاقے کی کوئی خاص رات ہوگی، لیکن پش وپیش کے سناٹے نے اسے پھر آسیبت کی لپیٹ میں لے لیا۔اس پر چھٹے حواس کی نیم خوابی، نیم بیداری طاری ہوگئی ۔رات نصف سے کافی آگے بڑھ چکی تھی ۔اس موت کے شہر کی روایتوں کے مطابق وہی سیاہ سیاہ روحوں کے سائے چاند کی ہلکی بدلی کے آنچل میں چھپتے ہی ان ویران کھنڈروں اور وروں کی ہوئی زمینوں سے نکل پڑے تھے ۔پھر وہ ایک عجیب اور خوفناک انداز میں منتشر ہوتے ہوتے شکستہ کھنڈروں کی ٹوٹی چھتوں پر،ٹوٹی دیواروں پر، شکستہ ستون اور میناروں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں اور چٹانوں پر ناچنے لگے ۔جیسے سیکڑوں روحیں ایک ہی وحشت کا سلسلہ ہو۔وہ گھبرا کر چونک پڑا ۔دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چند لمحوں کے بعد اس کے حواس بجا ہوئے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا، بجز حسب معمول سکوت کے اور چاند کو چھوڑ کر بادل کے ٹکڑے آگے بڑھ چکے تھے ۔

اس کی طبیعت گھبرانے لگی تو وہاں سے اٹھ کر وہ پھر اندر کھنڈر میں آگیا ۔باہر خنکی

Akram Allahabadi

زیادہ پھیل چکی تھی۔ اپنی پرانی جگہ بری طرح نڈھال کیفیت میں بیٹھے ہوئے اس نے ایک لمبی سی سرد سانس کھینچی اور بڑبڑایا۔ ”مجھ پر کچھ بھی بیت جائے مگر میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔ تم ضرور آؤ گی، اوشا۔ تم نے کہا تھا کہ محبت سب سے بڑی دعا ہے۔ وہ قدرت کو اپنی تکمیل کے لیے مجبور کر سکتی ہے۔ اگر میری محبت سچی ہے تو تم مجھ سے دور نہ رہ سکو گی، اوشا۔ میں اپنی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے پیچھے کی طرف ٹیک کر اپنا سر ملبے کے ایک بڑے پتھر کے ٹکڑے پر دھر دیا۔ اس وقت پھر آنسو اس کی پلکوں سے تواتر کے ساتھ ڈھلک رہے تھے۔ گرم گرم قیمتی آنسو، لیکن وہ جا چکی تھی جو ان کی قیمت جانتی تھی۔

رات جب بہت بوجھل ہو گئی تو اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

صبح کھنڈر کے مشرقی شگافوں سے جھانکتی ہوئی سورج کی گرم کرنوں نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سارا بدن اینٹھا اینٹھا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہی پھر کل کے ناخوشگوار واقع کی دکھتی یاد اس کے دل میں نشتر زنی کرنے لگی۔ یہ وہ غم تھا جو ہر سانس سے پیوست معلوم ہو رہا تھا، بھولنے میں نہ آتا تھا۔ چاروں طرف موت کے شہر کے آثار صبح کی سنہری کرنوں میں نہائے بت بنے کھڑے تھے۔ وہ سوچنے لگا روحوں کی اس بستی میں کتنی بھیانک گزاری ہے اس نے، مگر... مگر کچھ بھی تو نہ تھا... اور... وہ بھی نہ آئی، اوشا کی روح۔ تصور نے پھر اس کی سانسوں کا سکون چھین لیا اور اوشا کی روح کا خوبصورت سنجیدہ اور کھلا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں میں کانپنے لگا جس طرح سینما کے پردے پر کسی عکسی حسن کی جھلک۔

”میں واپس نہیں جاؤں گا، اوشا۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا۔“ پھر اسی کھنڈر کے سناٹے میں اس کی بڑبڑاہٹ پھیلنے لگی۔

Akram Allahabadi

اس کے باوجود وہ اپنے اندر اس جنون کی کل جیسی شدت کو ہلکا محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ بھیانک رات بہت سی تلخیاں چرا لے گئی ہے، جیسے آج ایک نئی امید نے جنم لیا ہو۔ یہ بھی ایک نفسیاتی تجزیہ ہے کہ شب خوابی کے بعد آدمی کی طبیعت یا تو گزشتہ دن کی ناخوشگواری کے اس بوجھل اثر سے خالی ہو جاتی ہے جو سونے سے پہلے اس پر مسلط رہا ہو یا پھر اس بوجھ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور نیا دن اور زیادہ کرب انگیز بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ کل کی نسبت کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ شاید آج کے اس وقت کے خیال سے جب اوشا کی روح ان کھنڈروں کی طرف آیا کرتی تھی۔ دوپہر کے ویران سناٹوں میں۔ شاید وہ آج اسی وقت پر آئے، لیکن اس شاید سے بھری امید میں بھی ایک کسک تھی۔ اس کے اس موتے سے جملے کی کہ 'جس دن ہمیں کوئی تیسرا دیکھ لے گا، ہم شاید پھر کبھی نہ مل سکیں گے'۔

مگر اوشا کی روح نے بھی تو شاید کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس شاید میں کس قدر گنجائش ہوتی ہے۔ ایک امید کو پھیلنے کی یہ نزاکت احساس خوب سمجھتی ہے۔ اور پھر اس کے ڈوبتے دل کو اس شاید کا سہارا مل گیا۔ وہ اس کھنڈر سے نکل کر باہر ٹیلے پر اور پھر ٹیلے کے نیچے ٹہلنے لگا۔ وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اسے اس امید میں بھی ایک عجیب سا ڈر تھا۔ ممکن ہے اس کے لوٹ جانے سے وہ ہمیشہ کے لیے ہی ناراض ہو کر چلی جائے۔ اور اوشا کی روح کی اس غیر مختتم ناراضگی کا تصور ہی اس کے لیے ایک ایسی شدید ترین اذیت تھی جس پر موت کو ترجیح دی جا سکے۔

کسی طرح دوپہر قریب آ گئی اور اس کے قریب آتے آتے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بار بار اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی جب وہ اس ویران سناٹے میں کوئی سرسراہٹ محسوس کرتا، لیکن ہر بار اس چمک کو بجھ جانا پڑتا۔ دوپہر سر پہ آتی جا رہی تھی اور اس کی بیقراری پاگل پن کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ دل کی ہر دھڑکن اندر سے کہتی، 'اوشا، ایشور کے لیے آ جاؤ'۔ اور نگاہیں کھنڈر کے گوشے گوشے میں کسی کو ڈھونڈنے لگتیں۔

اچانک زمین کانپنے لگی نظر کانپنے لگی اور نظر میں آنے والی ہر شے کانپنے لگی۔ یہ آسام میں زلزلے کا ایک اور جھٹکا آیا تھا۔ بہ بادوڈیہ وگڑھ ایک بار اور موت کے مرتعش ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ کیا کرے؟ اور ارد گرد ٹیلے سے دور اور قریب کے کچھ کھنڈروں کے رہے سہے آثار پگھل پگھل کر زمین پر آنے لگے جن کے شور نے اس موت کے شہر کی خاموش فضا میں کسی بڑے کارخانے کی وزنی مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ پیدا کر دی۔ وہ پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک بغل کے بڑے کمرے سے وہی سیاہ بلی کود کر بھاگی، وہ چونک پڑا۔

''اوشا کی روح۔'' اس کے خیال میں وہ اوشا کی روح ہی تھی جو سیاہ بلی کے روپ میں اس کھنڈر میں داخل ہوا کرتی تھی اور بعد میں نامعلوم طور پر اپنے اصل روپ میں مجسم ہو جاتی۔

''اوشا...'' وہ خود ہی چیخ اٹھا اور کالی بڑی بلی اس کے سامنے سے جست مار کر نکلتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔

''اف۔'' وہ چیخ اٹھا۔ لرزتی ہوئی زمین نے اوپر ٹکی ہوئی کھنڈر کی چھت کے اس آخری ٹکڑے کو بھی نیچے کھینچ لیا جو اتفاق سے اوپر اٹکا رہ گیا تھا۔ اور وہ سیاہ بلی ایک باریک سی چیں کی آواز کے ساتھ اس میں دب کر رہ گئی۔ روپ نے اس کی طرف دوڑنا چاہا، لیکن ان کے درمیان دوسرا استون جو داہنی طرف چھت کے ٹکڑے کو سنبھالے تھا لڑھک کر زمین پر آ رہا۔

زمین کے ارتعاش نے روپ کو پیچھے کی طرف گرا دیا، ورنہ وہ بھی اس کی زد میں آ جاتا۔ یہ دوسرا زلزلہ تقریباً ۱۵ منٹ تک رہا۔ اور اس کے بعد فضا کسی پرانے قبرستان کی طرح خاموش اور بھیانک ہو گئی۔ اتنی دیر میں موت کے شہر کے کھنڈر اپنی ہیئت تبدیل کر چکے تھے۔ اونچائیاں اور نیچی ہو گئی تھیں اور نچلے زمین پر لیٹ گئے تھے۔ پھٹی ہوئی زمین کی دراڑوں پر اٹکے ہوئے اکثر زمین افتادہ درخت لڑھک کر ان دراڑوں میں سما گئے تھے اور آسمان پر چیختی چلاتی چیلوں اور گدھوں کے غول کے غول خوفزدہ انداز میں اڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کے نشیب کی طرف جنگلی سیاروں اور آوارہ کتوں کے جتھے بھاگے جا رہے تھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ بدن کے کپڑوں کی دھول جھاڑتے ہوئے اس نے اس سیاہ بلی کو ملبے کے ڈھیر سے نکالا۔ سرخ سرخ خون اس کے جسم پر پھیلا تھا۔ اس نے اپنے باریک باریک دانت باہر نکال دیے تھے۔ اس کی خوفناک زرد آنکھوں میں سے ایک آنکھ میں صرف پانی اور خون رہ گیا تھا۔ وہ مرنے کے بعد اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا یہ تم ہو، اوشا؟" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"مگر روحیں مرا نہیں کرتیں۔ تم بار بار نہیں مرسکتیں۔ اف، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے طاقت کے ساتھ اپنے سر کو دبا کر پیچھے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے محبت کے نازک احساسات پر پھر کون سی کاری ضرب پڑ گئی۔ اس کے تھکے ہوئے آنسو نکل بہہ نکلے۔

"بھگوان، مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں یہ سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتا؟ اور جب اتنی ہی محبت دینی تھی کسی سے تو اس طرح مجھے کیوں اجاڑ دیا تم نے؟" اور پھر وہ ہتھیلیوں پر چہرہ رکھ کر رونے لگا۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح سر اوندھائے گم سم بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف ۰ اڈگری اور ڈھل گیا۔

اچانک کچھ کھڑبڑاہٹ کی آواز قریب سے سن کر وہ چونک پڑا۔ جیسے اوشا کی روح اچانک آ پہنچی ہو۔ اور جب اس نے جھکی ہوئی بھیگی پلکیں اٹھائیں، اس کے سامنے اس کے پتا پنڈت پرکاش چندر کھڑے تھے جن کے ساتھ کشور اور چٹر جی کے علاوہ ان کا بوڑھا نوکر شمبھو بھی تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

باپ نے بیٹے کو دیکھا، بیٹے نے باپ کو۔

وہ بالکل اس کے قریب آ گئے اور پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے، روپ؟"

Akram Allahabadi

روپ کا دل دکھا ہی ہوا تھا۔ وہ رو دیا۔

"بڑے نادان ہو، بیٹے۔ تم یہ شیخ چلی کے خواب کب سے دیکھنے لگے؟" وہ اسے سمجھانے لگے۔

"پتا جی..." روپ نے بولنا چاہا، لیکن الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔

"میں چتر جی سے سب کچھ سن چکا ہوں۔ اچھا ہوا جو کل اس نے مجھے تار دے کر ہوائی جہاز سے بلا لیا، ورنہ نہ جانے تمہاری یہ دیوانگی کیا رنگ لاتی۔"

"مگر پتا جی یہ..." اس نے چترجی کی طرف کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بولنا چاہا۔

"چترجی سے زیادہ وفادار تمہارا کوئی ساتھی نہ ہوگا۔ تم بڑی بھول کر رہے ہو، بیٹے۔" انھوں نے اسی نرم لہجے میں اسے تھپکی دی۔

"مگر یہ سب سچ ہے، پتا جی۔ سب سچ ہے۔" روپ چیخا۔

"ایسے ویران مقام پر آدمی کا آسیب زدہ ہو جانا تعجب خیز نہیں، مگر تم تو پڑھے لکھے ہو، بیٹا۔ تمہیں ایسا نہ ہونا چاہیے۔" پنڈت پرکاش چندر نے اسے نصیحت کرنی چاہی۔ لیکن روپ جیسے کچھ سننے سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"وہ ضرور آئے گی، پتا جی۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آئے گی۔ میں زندگی کے آخری سانس تک اس کا انتظار کروں گا۔ پتا جی، مجھے معاف کر دیجیے۔ ایشور کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔" وہ اپنے جذباتی جنون سے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ جوڑنے لگا۔

"لیکن تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہیں کسی آسیب کے ہاتھوں مرنے کے لیے یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔" پنڈت پرکاش چندر کے لہجے میں سختی آ گئی۔

"میں نہیں جاؤں گا، پتا جی۔" روپ نے پاگلوں کی طرح سر کو جھٹک کر اٹھتے ہوئے کہا۔

Akram Allahabadi

"یہ ہمت۔" یہ کہتے ہوئے باپ کو غصہ آ گیا اور انھوں نے ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر کھینچ مارا۔ روپ کو طاقتور باپ کے طمانچے سے چکر آ گیا۔ پنڈت پرکاش نے چٹرجی اور کشور کی طرف منہ کر کے کہا۔

"یہ کیوں نہیں جائے گا۔ اسے زبردستی لے چلو۔"

سب اس کی ضدی فطرت سے واقف تھے۔

چٹرجی اور کشور نے دونوں طرف سے اسے زبردستی پکڑ لیا۔

وہ چیخا۔ "چٹرجی، میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"شوق سے، مگر گھر پہنچ کر۔" چٹرجی نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

روپ لاکھ مچلا، لاکھ چیخا، لیکن اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور اس طرح زبردستی اسے اس موت کے شہر سے اٹھا لے جایا گیا۔ اسی کیمپ میں اس دن کے باقی گھنٹے اور وہ رات اس پر سخت نگرانی اور قید کی گزری اور دوسرے دن ہی ایک ٹرک کے ذریعے ڈیرہ گڑھ کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر ایک مخصوص طیارے سے پنڈت پرکاش چندر، روپ، چٹرجی، کشور اور شمبھو کے ساتھ کلکتے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

واپس

روپ کی ماتا جی چترجی کے آئے ہوئے تارے بری طرح گھبرائی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی روپ کو پریشان صورت مرجھایا سا اپنے پتا، بھائی اور چترجی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا، دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئیں۔

"یہ کیا ہوا تجھے میرے لال۔" وہ اس کے ماتھے سے پریشان بالوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ روپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی رونق ضرور آئی، لیکن پھر اداسی پھیل گئی۔

پنڈتائن کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کے پتا کی طرف پلٹ پڑیں۔

"ضرور تم نے اسے کچھ کہا ہے۔ تم سے لاکھ بار کہا جوان لڑکے پر غصہ نہیں کیا کرتے۔" وہ جیسے پنڈت پرکاش چندر سے لڑ پڑنے کے موڈ میں تھیں۔ پنڈت جی اس غیر متوقع سوال پر حیران سے رہ گئے۔

"پتا جی نے مجھے کچھ نہیں کہا، ماں۔" روپ خود ہی ڈوبی ہوئی سی آواز بول اٹھا۔

"پھر ایسی کیا بات ہوئی ہے تجھے، جو یہ اجاڑ حلیے بنا رکھے ہیں؟" ماں نے پیار اور غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا۔]

"تم نہ سمجھو گی، ماں۔ کوئی نہ سمجھے گا۔ یہ سب مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔" اس نے سنجیدہ اور اداس لہجے میں جواب دیا۔

"پاگل...؟ یہ خود پاگل ہیں۔ میرے بھلے چنگے بیٹے کو جو پاگل سمجھے وہ مہا پاگل۔"

پنڈتائن کے غصے کا بہاؤ پھر روپ کے پتا کی طرف گھوما۔

"مگر تم سے کم۔ تمہارے ہی لاڈ نے لڑکوں کو اتنا ضدی بنا دیا ہے۔" پنڈت جی پہلے

مسکرا کر پھر سنجیدہ ہو گئے۔

ہونہہ، بڑے آئے باپ بن کر۔ اولاد پالنا بھی جانا تھا۔ جوتا ہاتھ میں لے کر اولاد نہیں پالی جاتی۔ اپنا سکھ چین حرام کرنا پڑتا ہے۔" پنڈتائن اپنے احسان جتاتے ہوئے بولیں۔

"خیر تم جانو اور تمہارا بیٹا۔ پوچھو خود اسی سے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی چھڑی صوفے پر پھینکتے ہوئے دوسرے کمرے میں جانے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر دروازے پر رک گئے اور پلٹ کر چٹرجی سے بولے۔

"بیٹا چٹرجی اور کشور، تم لوگ اس خبطی کو کہیں اکیلا نہ جانے دینا... اور نیلا کہاں ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"نیلا رسوئی میں ہے۔" پنڈتائن بولیں۔ "اسے کہاں خبر ہے نہیں تو آٹے میں ہاتھ سوندے خوشی سے دوڑی دوڑی آتی۔" ماں جی نے اپنی طرف سے نیلا کی محبت جتا دی۔ اور روپ اس پر خاموش رہتے ہوئے بھی بُرا سا منہ بنائے نہ رہ سکا۔

"نیلا بیٹے۔" پنڈت جی نے زور سے اندر کے کمرے کی طرف رخ کر کے آواز دی۔

ذرا سے وقفے کے بعد جواب ملا۔ "آئی چاچا جی۔"

اور ایک منٹ بعد ہی نیلا رسوئی سے تیز قدم چلتی ہوئی آ پہنچی۔ اس نے اس وقت باریک سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ بال پیچھے کی طرف بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ کسی قدر اداس اور زرد سا تھا۔ آنکھوں میں ایک کرب آگیں کیفیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا عرصے سے سنگار کرنا چھوڑ رکھا ہے۔ اسے اس باریک سفید لباس میں چند سیکنڈ روپ دیکھتا رہ گیا، جیسے اوشا کی روح اس کے سامنے اپنے مخصوص سفید پوشاک میں کھڑی ہو۔ مگر فوراً ہی وہ چونک پڑا۔

نیلا کو دیکھ کر اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ نیلا نے اس کے طرف مسکرا کر دیکھا پھر نظریں پنڈت جی کی طرف پھیر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی مسکراہٹ میں بھی تصنع

Akram Allahabadi

ہے۔ جیسے اس نے چہرے پر جو خوشی کے آثار اس وقت جھلکتے نظر آئے، وہ صرف ایک دکھاوا ہیں، لیکن شاید ہی روپ کے سوا کسی اور نے محسوس کیا ہو۔

''بیٹی روپ کا خیال رکھنا۔ تم سب مل کر کوشش کرو کہ اسے گھر اور گھر والوں سے دلچسپی ہو سکے۔'' پنڈت جی نے نیلا سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''جی۔'' نیلا نے کسی قدر شرما کر سر جھکا لیا۔

''بیٹا چتر جی، تم کو ابھی روپ کی شادی تک تو ہمارا مہمان رہنا ہی پڑے گا۔''

انھوں نے چتر جی کی طرف رخ بدلا۔ چتر کی کے نام پر نیلا نے کسی قدر چونک کر چتر جی کی طرف دیکھا جو ماں جی کے پیچھے خاموش کھڑا ہوا تھا۔ چتر جی کی دزدیدہ نگاہیں بھی نیلا کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے نیلا کے چہرے کی رنگت بدل سی گئی۔ ایک سرخ تمتماہٹ اور پھر زردی۔ چتر جی نے جیسے بابو جی کے الفاظ سنے بھی نہیں، وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق تھا اور روپ صوفے پر گم سم سا ہو کر سر جھکائے بیٹھ رہا تھا۔ شادی کے لفظ پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چتر جی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ایک سمجھ میں نہ آنے والی گہری سنجیدگی اس پر طاری ہو گئی۔

''مہمان کس لیے، آخر یہ گھر بھی تو انہی کا ہے۔ جیسے روپ ویسے چتر جی۔'' ماں جی نے خوش ہو کر بابو جی کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ پھر وہ چتر جی سے بھی پوچھ بیٹھیں۔

''کیوں بیٹا چتر جی؟''

وہ ایک دم اپنے انہماک سے چونک پڑا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''جی... جی ہاں، جی ہاں۔ ایسا تو ہے ہی۔''

لیکن روپ دیکھ رہا تھا کہ چتر جی کی جذباتی کیفیت اس وقت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ مصلحتاً وہ اٹھ کر اندر والے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ چتر جی ایک ہوشیار محافظ کی طرح اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ نہ بولے۔

Akram Allahabadi

اس دن روپ نے نہ کپڑے بدلے نہ کچھ کھایا۔ صرف اپنے کمرے میں خاموش پڑا رہا۔ اس پر واقعی اتنی کڑی نگرانی مسلط کر دی گئی تھی کہ اس ماحول سے فرار اس کے بس سے باہر تھا، لیکن وہ اندر سے اتنا ہی بے سکون بلکہ ایسے موقع کا متلاشی تھا کہ وہ اس قید سے نکل کر کسی طرح چل کر، بھاگ کر، اڑ کر پھر اسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس کی زندگی کے حسین رومانی لمحے لٹ گئے تھے۔ جہاں وہ سب کچھ چھوڑ آیا تھا۔ ایک لاوارث دل کی طرح۔

چٹرجی اب ہر وقت روپ سے قریب تو نہ رہتا لیکن اس کے کمرے کے اردگرد موجود رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس گھر میں آتے ہی اس کی سنجیدگی ایک مستقل خاموشی اور گہری اداسی میں بدل گئی تھی جس کا سبب کوئی نہ جانتا تھا بجز روپ کے، اور روپ ہی کی خاطر چٹرجی اپنے آپ کو وہ کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ نہ تھا۔ وہ انتہائی ضبط کے ساتھ اپنے ہر لفظ، اپنی ہر حرکت سے خود اپنے ہی انجذاباتِ محبت کی تردید کرنا چاہتا تھا جو اس کے دل میں نیلا کے لیے تھے۔ نیلا آتے جاتے سامنے پڑتی تو دونوں چونک پڑتے، ایک دوسرے کو دیکھ کر۔ پھر دونوں طرف اداس اور مایوس سی نظریں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کچھ کہتی ہوئی جھک جاتیں، جیسے ان کے دلوں میں چور ہو اور وہ انھیں اپنے دل کے اندر ہی گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہتے ہوں۔ کبھی کبھی اتفاقیہ اور اچانک ایک دوسرے کے سامنے آجانے سے ان کے لبوں کو خفیف سی جنبش ہوتی، لیکن ان سے آواز نہ نکل پاتی اور وہ دوسرے لمحے میں سنبھل کر اپنے دوراہے پر علیحدہ علیحدہ تقسیم ہو جاتے۔ تقسیم جو گھاؤ سے زیادہ خطرناک ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے دلوں کے، زندگیوں کے اور ان امیدوں کے جو ان دونوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔

نیلا اندر سے خوش ہو یا نہ ہو، لیکن ویسے وہ بالکل مطمئن نظر آتی تھی۔ وہ بہت گہری تھی۔ اس کے کردار میں سمندر سے زیادہ گہرائی تھی۔ سب یہ جانتے تھے کہ وہ وہی کچھ ہے جو نظر آتی ہے، لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ اس پرسکون چٹان کی تہ میں کون سا لاوا پک سلگ رہا ہے۔ وہ جوالا مکھی کبھی پھٹے گی یا چٹانوں کی تہ میں دفن ہی رہے گی۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہ تھا اور روپ

کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ روپ نہ بد اخلاق تھا نہ وحشی، وہ اس سے ہمیشہ کی طرح نرمی اور محبت سے پیش آتا، یہ اور بات ہے کہ اسے نیلا سے کوئی محبت نہ تھی اور تھی تو صرف اتنی جتنی ساتھ پلے ہوئے دو دوستوں یا دو قریب کے عزیزوں میں ہوتی ہے۔ وہ اس کے بارے میں بالکل اس طرح سوچنے کو تیار نہ تھا، جس طرح ماتا جی اور باپو جی سوچ رہے تھے۔ پھر بھی وہ نیلا سے بیزاری یا نفرت کا اظہار نہ کرتا تھا۔ وہ بے قصور تھی۔ وہ مظلوم تھی۔ قربانی کے بکرے کے بکرے سے زیادہ معصوم اور مجبور۔ ماں کے احسانوں نے اس کی مغموم جوانی کو اپنے بیٹے کے لیے خرید لیا تھا۔ نیلا اس کا دل بہلانے کے لیے، کسی نہ کسی بہانے ان کے قریب رہتی۔ کبھی باتوں ہی باتوں میں اس کے ساتھ کیرم یا صحن میں بیڈمنٹن کھیلنے لگتی۔ کبھی اس کی دلجوئی کے لیے اس کے سامنے ناچتی۔ بنگالی گھرانوں میں سگھڑ اور اچھے گھروں کی لڑکیوں کے لیے ناچ جاننا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے شوہر کے اس ذوق کی تشنگی کو بھی مٹا سکیں، جس کے لیے اکثر رنگین مردان گندے بازاروں میں جا بھٹکتے ہیں جہاں حسین نقرئی نغموں کی آڑ میں جنس لطیف کے مہنگے سودے ہوا کرتے ہیں۔ اتنے مہنگے کہ ننگا کردیں اور اتنے مکروہ کہ ضمیر ہمیشہ گالیاں دیتا رہے۔ حالانکہ روپ بالکل مختلف تھا۔ اسے نہ سوسائٹی کی رنگینیوں سے دلچسپی تھی نہ وہ تفریحات کا عادی تھا۔ تنہائی پسندی اور خاموشی اسے زیادہ محبوب تھی۔ وہ گھر میں بولتا بھی سے تھا، کیونکہ اندر سے غم و مایوسی کی بھٹی میں سلگتے ہوئے بھی وہ اوپر سے زندہ بشکل مردہ بنے رہنے کا قائل نہ تھا، اداس صورت، زبانی ہمدردیاں حاصل کرے، لیکن درد کا درماں نہیں خرید سکتی۔ زخم اپنے وقت پر بھرتے ہیں، مصیبت اپنی تکمیل پر ٹلتی ہے۔ ہونی ہو کر رہتی ہے اور انہونی کا خوف کرنا حماقت ہے۔ پھر نڈھال اور مجسم فریاد رہنے سے فائدہ۔ دل کی کسک دل میں ہی بھلی ہے۔ وہ غم کیا خاک لذت دے جو بیان کردیا گیا ہو۔ اسی لیے وہ کسی کو کچھ نہ بتاتا، کسی سے کچھ نہ کہتا۔ اس کی مستقل سنجیدگی کا سبب چٹرجی ضرور جانتا تھا، لیکن روپ نے پھر اس کے لیے چٹرجی سے کوئی گفتگو نہ کی۔ خود چٹرجی اسے وقتاً فوقتاً ایسے نفسیاتی انداز سے وہم و آسیبیت پر لیکچر دیا کرتا،

Akram Allahabadi

جن سے کسی طرح روپ کے ذہن سے پچھلی باتوں کا تصور ایک وہمی تشکیل بن کر غائب ہو جائے، جو کچھ ڈیروگڑھ میں ہوا وہ اسے یہ سمجھ کر بھول جائے کہ یا تو ایک خواب تھا یا ایک پاگل پن جو وہم کی شدت سے آسیبیت میں بدل گیا تھا۔چٹرجی نے مصلحتاً دوبارہ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کی نفسیاتی کتابیں اس کی میز پر لاکر رکھ دیں تھیں اور اس خاموش سوال کا مفہوم یہ تھا کہ انھیں پڑھو اور اپنی پچھلی حماقتوں پر افسوس کرو۔

ڈیروگڑھ کے ویران ماحول سے دور ہو کر ہنگامہ خیز شہری دنیا میں واپس آ جانے کے بعد اس کھنڈر والے واقعات کے اثرات چٹرجی کے ذہن سے تو زائل ہو چکے تھے۔اس نے اپنے دل میں یہ یقین کر لیا تھا کہ روپ کی وہم زدہ باتوں نے اسے بھی شدید طور پر اسی وہم سے متاثر کر دیا تھا جس کا شکار خود روپ تھا اور اسی وجہ سے اسے بھی وہ روح نظر آئی جس کا حقیقتاً کوئی وجود ممکن نہیں۔وہ ضرور ایک فریب نظر تھا۔

اور اپنے اس نظریے کا قائل روپ کو کرنے کے لیے وہ اسے طرح طرح سے سمجھانے ی کوشش کرتا۔روپ اس کی باتیں سنتا اور صرف مسکرا دیتا اور سنجیدہ ہو جاتا۔کچھ چٹرجی کی ایک ہی جیسی باتیں جن سے بار بار احساسات پر ضرب لگتی ہو اور دماغ کو کچھ نہ کچھ قبول کرنا پڑے، کچھ نیلا کی قربت اور کچھ گھر کا ماحول ان سب نے مل کر روپ کو ایک ڈیڑھ مہینے میں اس قدر ضرور بدل دیا کہ اس کے چہرے کی گئی ہوئی رونق لوٹ آئی۔گہری سنجیدگی معمول پر آ گئی اور وہ کبھی کبھی ہنسنے بولنے لگا۔ماں جی کی بار بار ہدایتوں پر نیلا روپ کو اپنی طرف ملتفت کرنے کے لیے فیصلہ کن طریقے پر آمادہ ہو چکی تھی۔وہ اس کے نیم خوابیدہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرتی۔اس کے سامنے اس انداز سے رقص کرتی کہ کبھی کبھی وہ اسے غور سے تکنے لگتا۔لب و لہجے میں بھی اس نے اتنی لوچ پیدا کر لی تھی کہ روپ کو اس میں معشوقیت کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔وہ زیادہ تر اس کے قریب رہتی۔کبھی کبھی تو اس کے پاس صوفے پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکتی کہ وہ ہنس پڑتا۔کبھی زبردستی اس کے ہاتھ سے قلم چھین

Akram Allahabadi

کرا سے پریشان کرتی۔ رفتہ رفتہ روپ اس میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کی زندگی میں یہ دن وہ پہلا دور تھا جب اس نے کسی عورت کو اتنے قریب محسوس کیا تھا۔ نیلا سے قریب ہونے کی پہلے اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اس سے نفرت نہ کرتا تھا تو کوئی دلچسپی بھی محسوس نہ کرتا تھا، لیکن اب وہ بدل رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی صرف فلسفیانہ خیالوں کی ویرانیوں میں بھٹکنے کا ہی نام نہیں۔ زندگی اتنی بے قیمت اور بے مصرف نہیں کہ اسے بے لطف لیے قربان کر دیا جائے۔ اب نیلا کو اس نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تو وہ اسے بہت خوبصورت اور پرکشش حد تک جوان نظر آئی۔ وہ عورت جو مرد کی بھوکی ہوتی ہے۔ خواہ وہ زاہد ہو کہ صوفی، فلسفی ہو کہ حکیم اور ولی ہو کہ شیطان۔ زندہ رہتے ہوئے جنسیات کے فطری روابط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر فرائڈ کی کتابوں اور ہیریز کے جنسیاتی مشوروں نے ایک بار پھر اسے حس و حرکت کی دنیا میں لا گھسیٹا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ خود ہی نیلا سے کہہ بیٹھا۔

"نیلا، تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔"

"سچ؟" نیلا نے آج اپنی تمام کوششوں کا جواب پا کر مسکراتے ہوئے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ مگر یہ دکھاوے کی خوشی، یہ مصنوعی مسکراہٹ، اس کے اندر کی ایک اذیت ناک کسک کو نہ چھپا سکی اور اس کے چہرے پر سرخی کے ساتھ زردی بھی چھلک پڑی۔ روپ اس وقت جذباتی طور پر اس سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے بڑھ کر نیلا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے قریب گھسیٹ کر سینے سے لگا لیا۔

"اونہہ۔" یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اس کی گرفت سے نکل گئی۔ روپ نے اس کے پیچھے دوڑنا چاہا۔ وہ دروازے کے پاس رک کر پلٹتی ہوئی بولی۔

"میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

اچانک جیسے روپ کے سر پر کسی نے ایک وزنی ہتھوڑا کھینچ مارا۔

"میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا پیچھا

کرنے کی کوشش نہ کرنا...'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی دیوار کو گھور رہی تھیں اور ایسے وہ اپنا مخصوص سفید باریک لباس پہنے اپنے جانے کے وقت پر اٹھ کر اس شگاف کی طرف جا رہی ہو۔

''اوشا...'' وہ زور سے چیخ اٹھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر صوفے پر گر پڑا۔

گھر بھر میں پھر سنسنی پھیل گئی۔ کتنے دنوں تک خاموش پرسکون اور کسی قدر خوش رہنے کے بعد آج پھر اس پر آسیبیت کا دورہ پڑا تھا۔

ماں جی نے بابو جی سے کہا۔ ''کچھ بھی ہو اب اس کا بیاہ کر دو۔''

''جیسا جانو کرو۔ میں نے ایسی عجیب اولادیں پیدا کر کے ہی حماقت کی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

کمرے میں صرف ماں جی، ایک پڑوسن کاکی اور روپ رہ گیا۔ نیلا گلاس میں دودھ لینے گئی ہوئی تھی اور رچڑ جی کہیں باہر گیا تھا۔

''ماں، یہ شادی نہیں ہوگی۔ میں نیلا سے شادی نہیں کروں گا۔'' روپ صوفے پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔

''میرے گلے پر چھری نہ پھیرو، ماں۔''

''آخر کیوں؟ کیا تجھے پاگل بنا رہنے دینے کے لیے۔'' ماں نے ڈانٹا۔

''نہیں، ماں۔ تم سمجھتی نہیں۔'' وہ دونوں ہاتھ ملنے لگا۔

''کیا نیلا تجھے پسند نہیں؟'' ماں جی نے طنزیہ سوال کیا۔

''اف، اچھا ایسا ہی سمجھ لو، مگر میں یہ شادی نہیں کروں گا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''مگر یہ شادی ہوگی اور نیلا سے ہی ہوگی۔ تمام میں یہ بات پھیل چکی ہے۔'' وہ بگڑ گئیں۔

''مگر میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا اس سے۔ وہ... اب کیا کہوں ماں۔''

"آخر تم لوگ آزاد کیوں نہیں چھوڑ دیتے مجھے۔" وہ بے بس بچوں کی طرح روندھی شکل بنانے لگا۔

نہ جانے پڑوسن کاکی کیا سمجھ کر اٹھ کر چلی گئیں۔ ماں جی کو بھی اس کی باتیں اچھی نہ لگیں، وہ بھی کچھ دیر بعد یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

"روپ، یا تو یہ شادی ہوگی، ورنہ میں اپنا سر پھوڑ لوں گی۔"

اور روپ ایک عجیب بے بسی اور انتشار کے عالم میں دیوار تکتا رہ گیا۔

چتر جی بھی گھنٹہ بھر بعد آپہنچا۔ ماں جی نے اسے پہلے ہی اپنے پاس بلا کر اس سے کہا۔

"بیٹا، تمہیں سمجھاؤ اس پاگل کو۔ وہ شادی سے انکار کر رہا ہے۔ ہماری تو ناک کٹ کر رہ جائے گی۔ لوگوں میں پہلے ہی باتیں پھیل چکی ہیں۔"

کاش اس وقت ماں جی اس کی وہ جھکی ہوئی پلکیں دیکھ سکتیں جن میں آنسو لرزا ٹھے تھے۔ محبت کی تقدیر اسے کٹھن سے کٹھن امتحان میں ڈالتی چلی جا رہی تھی۔ اب اسے روپ کو سمجھانا بھی پڑے گا کہ تم اس لڑکی سے ضرور شادی کرو، کیونکہ وہ میری زندگی ہے۔ تم میری محبت کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دو، کیونکہ اسے گھونٹا ہی جانا چاہیے، کیونکہ ماں جی کہتی ہیں، نیلا کو پالنے والے ان کے احسان کہتے ہیں اور منگنی کی رسم کو خدا کا فیصلہ سمجھنے والے پڑوسی کہتے ہیں۔ میرے روپ میرا گلا گھونٹ دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔

مگر جب وہ روپ کے پاس پہنچا تو صرف اتنا کہا۔ "روپ، تم ماں جی کو ناراض کر رہے ہو، یہ اچھا نہیں ہے۔"

روپ نے اپنی خاموش نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "یہ تم کہہ رہے ہو، چتر جی۔" وہ بولا۔

"ہاں، کیوں؟ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں۔" چتر جی نے سنجیدگی سے کہا۔

Akram Allahabadi

"حق؟ بزدل آدمی، تمھیں تو صرف ڈوب مرنے کا حق ہے۔ تم وہ جھوٹے ہو جو اپنے آپ سے جھوٹ بولتا ہے۔ تم وہ فریبی ہو جو اپنے آپ کو اپنی زندگی کو فریب دیتا ہے۔" روپ طنز بھرے لہجے میں بولنے لگا۔

"روپ؟" چٹرجی چیخ اٹھا۔

"آج مجھے کہنے دو میرے بیوقوف دوست۔ جس کیرکٹر کی آڑ میں تم اپنی محبت کا خون کرتے رہے ہو، وہ کیرکٹر نہیں بزدلی ہے۔ حقیقت سے فرار ہے، سچائی کی توہین ہے۔ کاش میں تم سے نفرت کرسکتا۔" روپ تقریباً دانت پیسنے لگا۔

"روپ۔" چٹرجی نے آنسوؤں بھری آنکھیں اوپر کیں۔ "کیا تم سے مجھے یہی امید ہوسکتی تھی۔" وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"آج میں اس خلوص سے بھی متاثر نہیں ہوسکتا، چٹرجی۔ میں تمہارا جھوٹ تمہارے سر پر مارنا چاہتا ہوں۔ تم میرے پاس سفارش کرنے آئے ہو کہ میں نیلا سے شادی کرلوں۔ تم میرے سامنے اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر آئے ہو کہ میں اس پر ایک اور ٹھوکر ماردوں۔ تم مجھے سمجھانے آئے ہو کہ میں تمہارا خون کردوں، بزدل ساتھی۔"

"جب تمھیں یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو تو تمھیں کیا حق تھا کہ اس سے محبت کرو۔" روپ بگڑتا چلا گیا۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو؟" چٹرجی پھر چیخ اٹھا۔

"مجھے کہنے دو۔ تم نیلا سے آج سے نہیں، اس دن سے محبت کرتے ہو جب تم یہاں آئے تھے، جب تمھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ماں جی میرا رشتہ نیلا سے کرنا چاہتی ہیں۔ میں سب جانتا ہوں، چٹرجی۔ میری آنکھیں اندھی نہیں ہیں۔ دوست کے دکھ درد پر نظر نہ رکھنے والا دوست ہی نہیں ہے، مگر..." کہتے کہتے روپ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "تم نے مجھے غیر سمجھا۔ تم نے یہ نہ سوچا کہ جو قربانی تم میرے لیے دینا چاہتے ہو، وہی قربانی تمہارے لیے دینے کا مجھے بھی حق

ہے۔تم نے ایسا کیوں کیا، چتر جی؟ تم نے اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کیوں اجاڑلی؟'' روپ تقریباً رو دیا۔ چتر جی جواب تک ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ منجمد اور اٹل تھا، آج وہی مضبوط آدمی بہت دیر سے اپنی چیخیں روکے ہوئے کسی بچے کی طرح منہ بسور کر رو پڑا۔ بالکل معصوم اور پاکیزہ۔ شاید ایسے خلوص اور محبت کے آنسو کبھی فرشتوں نے بھی نہ بہائے ہوں گے۔ وہ صوفے پر گر گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے منہ ڈھانپ لیا۔ روپ کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے سے اس کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''پگلے، ابھی تو روپ زندہ ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تم روتے رہو۔''

''نہیں، ایسا نہ کرنا، روپ۔ ایشور کے لیے ایسا نہ کرنا۔ نیلا بدنام ہو جائے گی۔ ماں جی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ دو زندگیوں کی خوشی لوٹ کر تیسرے کی گود میں پھول ڈالنے کی کوشش نہ کرو، روپ۔ تم نہیں جانتے نیلا تم سے پیار کرتی ہے۔ اس نے کبھی میری طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ اسے یہاں میری موجودگی بھی پسند نہیں۔ روپ، ایشور کے لیے ایسا نہ کرنا، ورنہ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' چتر جی اپنے آنسو خشک کر کے بولا۔

''تم بہت خطرناک راہ چل رہے ہو، چتر جی۔'' روپ اس کی ضد سے ڈر کر بولا۔

وہ جانتا تھا ایک بار زبان سے کچھ کہہ کر چتر جی پھر اس سے نہیں ہٹتا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اس پر کوئی زور دیا تو کہیں واقعی یہ گھر چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہے، پاس والے کمرے سے ماں جی کی آواز آنے لگی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھیں۔ وہ دونوں سنبھل گئے۔ ماں جی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''میں نے ابھی پنڈت کو بلوایا تھا۔ اس نے اسی مہینے کی ۲۷ تاریخ کو وواہ کی مہورت نکالی ہے، سمجھے؟'' وہ اپنے بوڑھے انداز میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اس کی طرف کر کے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ روپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف چتر جی کی طرف دیکھ کر رہ گیا، جس کے چہرے پر روپ کی خاموشی سے ایک گہرا سکوت، ایک گہری سنجیدگی پھر سے

مسلط ہو چکی تھی۔

''بیٹا چتر جی، اب بس پانچ دن تو رہ ہی گئے ہیں۔ تیاری شروع کر دینی چاہیے۔''

ماں جی نے کہا۔

''جی، جی ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔'' چتر جی چونک کر بولا۔

اتنے میں پیچھے بابو جی بھی آ پہنچے، وہ اندر گھستے ہی بولے۔ ''بیٹے چتر جی، یہ انتظام سب تمہیں کو کرنا ہوگا۔ تمہاری بوڑھی چاچی کی فرمائشیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔ یہ لا دو، وہ ہونا چاہیے۔'' بابو جی کا موڈ ماں جی کو چھیڑنے کا تھا۔

''تو کیا میں خبطی ہوں؟'' ماں جی ان پر بگڑ پڑیں۔

''تھوڑی کسر ہے۔'' بابو جی نے ہنس کر کہا۔

''شرم نہیں آتی بچوں کے سامنے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔'' وہ یہ کہہ کر بگڑ کر چلی گئیں اور بابو جی ہنستے رہ گئے۔ روپ علیحدہ کچھ سوچ رہا تھا اور چتر جی خاموشی سے اس دل کی ڈوبتی دھڑکنیں سنبھال رہا تھا جس پر چوٹ پر چوٹ پڑتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی اور رات کا دامن چاروں سروں تک پھیل رہا تھا۔ چتر جی آج کچھ معمول سے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ ممکن ہے آج روپ سے جو باتیں ہوئی تھیں ان کے اثر سے۔ اس نے صرف شام کو روپ کے ساتھ چائے پی تھی۔ رات کا کھانا کھانے سے اس نے انکار کر دیا تھا، کیونکہ سر میں درد بھی تھا اور بھوک بھی نہ تھی۔ وہ اکیلا اپنے کمرے میں پلنگ کے قریب لگی ہوئی میز کے نزدیک چوڑی کرسی پر نیچے کی طرف پیر پھیلائے بیٹھا کسی گہرے خیال میں چھت کو تاک رہا تھا۔ گود میں ایک کتاب کھلی پڑی تھی جس پر سامنے والے ٹیبل لیمپ کی روشنی اتنی صاف پڑ رہی تھی کہ حرف حرف نظر آ سکے۔ کمرے کا دروازہ کھلنے پر بھی اسے خبر نہ

Akram Allahabadi

ہوئی۔ نیلا موٹے دل کی چینی کی پرچ میں دودھ کا بھرا ہوا گلاس لیے اندر آ گئی۔

اس کے چہرے پر بھی اس وقت ایک عجیب سی تھکن، ایک عجیب سی پژمردگی تھی۔ وہ قریب آ کر کھڑی ہو گئی، مگر چٹر جی نے چھت کو تاکتے تاکتے آنکھیں بند کر لی تھیں، اس لیے اسے خبر نہ ہوئی۔ البتہ نیلا کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی داہنی آنکھ کے کونے سے ڈھلکنے والے آنسو کو دیکھنے لگی، جو بڑی خاموشی سے دبے پاؤں دل کی گہرائیوں سے ابھر کر پلکوں کی اوٹ سے پھوٹ پڑا تھا۔ ایک موٹا سا آنسو، جو ایک مضبوط مرد کی آنکھ سے محبت کی نازک سی ٹھیس پر بہہ نکلا ہو۔ نیلا کا ہاتھ بڑھا، پھر سکڑ گیا۔ پہلے چہرے کی رنگت سرخ ہوئی پھر زرد ہو گئی۔ کتنی مجبور تھی وہ بھی۔

بدن کی ہلکی سی جنبش سے اس کی گود میں رکھی ہوئی کتاب نیچے گر پڑی۔ وہ چونک پڑا۔ اس سے پہلے ہی نیلا نے جھک کر وہ کتاب فرش سے اٹھا دی، مگر ایک چیز تو پڑی ہی رہ گئی تھی، جس کی وجہ سے چٹر جی کے چہرے کی زردی اور پھیل گئی، جیسے وہ ڈر رہا ہو کہ کہیں نیلا اسے بھی نہ دیکھ لے۔ اور نیلا نے اسے اٹھاتے وقت دیکھ ہی لیا۔ وہ نیلا کی تصویر تھی۔ جس پر کبھی بہے ہوئے چٹر جی کے آنسوؤں کے داغ اب بھی نظر آ رہے تھے۔ نیلا نے خاموشی سے اسے دے دی اور ایک سلجھی ہوئی معصوم نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولی۔

"دودھ پی لیجیے۔ ماں جی کہتی ہیں طبیعت بھلے خراب ہو، پر بھوکا ہونا ٹھیک نہیں ہے۔"

چٹر جی اس وقت کے اس اتفاق سے بوکھلا سا گیا تھا۔ نیلا کے جملے پر وہ چونک کر سنبھلا۔

"ماں جی کہتی ہیں؟" اس نے دہرایا۔ "وہ کہتی ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔" اس نے گلاس طشتری سے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے تھے اس وقت... ان سے؟" نیلا اچانک پوچھ بیٹھی۔

Akram Allahabadi

''کس سے، روپ سے؟'' چٹرجی نے پوچھا۔ نیلا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کچھ تو نہیں، میں نے کچھ نہیں کہا... میں... میں کہہ رہا تھا کہ... میں... میں بہت برا آدمی ہوں، بہت...'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں چٹرجی نے کہنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز میں اس وقت بھراہٹ سی تھی۔

''نہیں، آپ کہہ رہے تھے کہ نیلا کو یہاں میری موجودگی پسند نہیں۔'' وہ اس کی تردید کرتی ہوئی بولی۔

''لیکن یہ تو کوئی بری بات نہیں کہی میں نے۔'' وہ کسی قدر سنبھل کر بولا۔

''بری ہو یا بھلی، مگر آپ نے ایسا کیوں سمجھ لیا کہ میں اتنی بری ہوں۔'' کہتے کہتے نیلا کی آواز اچانک کانپ گئی۔

چٹرجی گھبرا گیا۔ وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔

''ایسا نہ کہو، نیلا۔ اس سے مجھے بہت تکلیف ہوگی۔ میں نے تمہیں کبھی برا نہیں سمجھا۔ میں تمہیں برا سمجھ ہی کیسے سکتا ہوں، جبکہ تم میں فرشتوں جیسی معصومیت اور گنگا کی لہروں کی پوترتا ہے۔''

وہ جیسے ان تعریفوں سے نیلا کی ذہنی بدگمانی کو دور کرنا چاہتا ہو یا جیسے وہ واقعی اس کے دل کی آواز ہو۔

''تو پھر آپ نے اپنی طرف سے کہہ ڈالا؟'' نیلا کے لہجے میں سوال تھا۔

''میں ڈرتا ہوں، نیلا، کہ کہیں ہم تینوں میں کوئی گہری غلط فہمی نہ پھیل جائے۔ میں نے کبھی تمہارے یا روپ کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا ہے، لیکن اس بات کو کہنے کے لیے میں مجبور تھا، نیلا۔''

''مجھے آپ سے نفرت ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا۔'' نیلا نے ٹیڑھا سوال کیا۔

''میں نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی، پھر مجھ سے کوئی نفرت کر سکے گا۔ ایسا تو مجھے

Akram Allahabadi

یقین نہیں، مگر میں تم دونوں کے بیچ ایک ایسی رکاوٹ سمجھا جا رہا ہوں جو روپ کے دماغ میں بسی ہوئی ہے۔" چٹرجی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جھوٹ نہیں کہتے۔ سماج کے دیے جانے والے حق سے وہ میرے جیون ساتھی ضرور ہوں گے، مگر ان کے دل میں میرے لیے کوئی واقعی محبت نہیں۔" وہ کسی قدر رُبھرے الفاظ میں بولی۔

"اور تم؟" چٹرجی کا مختصر سا سوال تھا۔

"میں نے بھی کچھ ایسا نہیں کیا۔ میں صرف ماں جی کے فیصلے کی پابند ہوں۔ ان کے مجھ پر بہت سے احسان ہیں۔" نیلا نے کہا۔

"کسی کے احسانوں کے لیے زندگی تو نہیں بیچ دی جاتی، مگر خیر ہونے والی باتیں ہو چکی ہیں۔" چٹرجی نے ایک سرد سی سانس کھینچ کر یہ کہتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔

"میں ہونی کی شکایت نہیں کر رہی، میں صرف یہ کہنے آئی تھی کہ آپ نے جو کچھ کہا، وہ آپ کو نہ کہنا چاہیے تھا۔" وہ دکھے ہوئے دل سے کانپتی آواز میں بولی۔

"کیا تمھیں اس سے واقعی دکھ پہنچا ہے؟" چٹرجی نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اور جواب میں نیلا کی خوبصورت آنکھوں میں چھائی ہوئی گھنیری سیاہ پلکوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ یہ اس کی تمام باتوں کا ایک آخری خاموش جواب تھا۔

چٹرجی کے چہرے کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ جیسے وہ اندر سے بری طرح بے چین ہو گیا ہو۔

"نیلا" وہ وارفتگی کے عالم میں اسے بالکل اپنوں کی طرح مخاطب کر گیا۔

"جی۔" نیلا نے تھراتی ہوئی پلکیں جھکا لیں۔ چٹرجی کا ہاتھ اس جذباتی از خود وارفتگی میں نیلو کی ان حنائی انگلیوں تک پہنچ گیا، جو اس نے میز کے سرے پر ٹیک دی تھیں، لیکن اس سے قبل کہ ان کی انگلیاں ٹکراتیں، وہ کانپ کر رک گیا۔

Akram Allahabadi

"اف، یہ میں کیا سوچنے لگا تھا۔ ایشور مجھے معاف کرے۔" وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دماغی پریشانی کے عالم میں فرش پر ٹہلنے لگا۔ "ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ دوستی اور فرض ہمیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں مجھ سے اتنی ہی محبت ہو جس قدر مجھے تم سے ہے، لیکن ہمیں سب کچھ بھول جانا پڑے گا۔ اس طرح کہ ہم جیسے ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہ تھے۔ میرے لیے یہ بہت مشکل ہوگا، لیکن میں درد کی کڑی چوٹیں سہہ لینے کا عادی ہو گیا ہوں۔ تمہاری محبت نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے۔ میں بہت سخت جان ہوں، نیلا۔ میں بہت سخت جان ہوں۔" چترجی کسی نیم پاگل کی طرح جذباتی رو میں بڑبڑاتا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بے طرح پھوٹ نکلے تھے۔

نیلا خموشی سے اس کی صورت تک رہی تھی۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چترجی کا جملہ اس کے نازک سے دل پر ایک بجلی بن کر گر رہا ہے۔ وہ اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔ چترجی کی مستقل اداسی اور کھوئے پن کی وجہ اسے معلوم ہو چکی تھی اور بظاہر مطمئن نظر ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی محبت سے پوری طرح متاثر تھی۔ کاش ماں جی کے احسانات اور طے شدہ رشتے کی نزاکت کا اسے احساس نہ ہوتا تو شاید وہ چترجی کی زندگی میں ویرانیوں کو اس طرح ڈیرہ جمانے نہ دیکھ سکتی۔

"تم سوچ رہی ہوگی کہ اب کیا ہوگا۔ جب محبت کا دروازہ جو دلوں کے اندر ہی اب تک دفن رہا تھا زبان تک آ چکا ہے، لیکن ہمیں کچھ نہ سوچنا چاہیے، ہوگا وہی جو ہو رہا ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اسے ہونا ہی چاہیے۔ ہمیں اجڑ ہی جانا چاہیے، تبھی دوستی اور احسانمندی کا سر اونچا رہ سکتا ہے۔ زمانہ کچھ نہ سمجھ سکے گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ ماں جی نے تمہیں بہو بنا کر پچھلے احسانوں سے بھی بڑا احسان کیا ہے۔ مگر یہ احسان بھی تمہیں اپنے سر لینا پڑے گا۔ لوگ کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے کہ بڑے بوڑھوں کی مرضی یہی ہے۔" وہ آپ ہی اسے سمجھاتا گیا۔

"میں اپنا فرض ادا کر دوں گی۔" نیلا ڈوبتے ہوئے، مگر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

Akram Allahabadi

''بیٹی نیلا۔'' باہر بابو جی کے کمرے کی طرف سے ماں جی کی آواز سنائی دی۔ نیلا گھبرا گئی۔ کافی دیر ہو گئی تھی اسے۔ وہ ایک آخری نظر چتر جی پر ڈالتی ہوئی جانے لگی۔

''قدم تو نہ ڈگمگائیں گے؟'' چتر جی نے اس کے چلتے چلتے کہہ دیا۔

''ایسا نہ ہوگا۔ بدقسمتی مجھے ورثے میں ملی ہے۔'' روندھے ہوئے لہجے میں یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی دن پڑوسن کا کی نے ماں جی اور روپ کی سنی ہوئی باتوں کی بنیاد پر دل سے گھڑ کر محلے میں خبر اڑا دی کہ لڑکی میں ضرور کوئی عیب ہے، تبھی تو لڑکا انکار کر رہا ہے۔

یہ ایک نئی مصیبت تھی جس نے روپ کو اور سخت امتحان میں مبتلا کر دیا۔ ماں جی آخر اس پر بگڑ ہی گئیں، بولیں۔ ''سن رہے ہو تمہاری اس بیوقوفی کی وجہ سے لوگ اس بیچاری معصوم لڑکی کے لیے کیا کہنے لگے ہیں؟''

''ہاں سن رہا ہوں۔'' روپ سنجیدگی سے بولا۔

''وہ غریب اس طرح بدنام ہو کر کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ اب تو یہ شادی ہونا ہی چاہیے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اور سن رکھو، روپ، اگر تم نے اور ضد کی تو میں افیون کھا کر سو رہوں گی۔'' ماں جی نے اسے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ روپ نے آخر ہمت ہار دی اور سرنگوں ہو کر بولا۔ ''اگر میری بربادی سے تم خوش ہو سکتی ہو، ماں، تو تم جو جی میں آئے کرو۔''

لیکن ماں جی تو اس کی باتوں کو صرف جوانی کا جنون سمجھتی تھیں، وہ اس کی زبان سے یہ فیصلہ سننے کے بعد اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کا رہا سہا تذبذب دور ہو گیا اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

آخر وہ دن بھی آ گیا جب چٹرجی کو واقعی اپنے ہاتھوں سے اپنے ارمانوں کی قبر کھود کر اپنی محبت کی دنیا میں بجتے ہوئے شادیوں اور رسمی سجاوٹوں کے درمیان آگ لگانی پڑی۔ سارا اہتمام اسی نے تو کیا تھا۔ اپنی بربادی کے ڈرامے کے اس آخری انجام کا۔ پھر بھی وہ فرشتہ نہ تھا، انسان تھا۔ انتہائے ضبط کے باوجود آج صبح ہی سے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ بار بار آنکھیں بھر آئیں اور وہ لوگوں کی نظریں بچا کر انھیں کرتے کی آستینوں سے جذب کر لیتا۔

ایک بار تو بابو جی کی نظر پڑ بھی گئی۔ وہ اسے کچھ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے، بیٹا چٹرجی؟ کیا طبیعت ٹھیک نہیں کچھ؟"

وہ بولا۔ "جی ایسا تو نہیں۔ دراصل آج بار بار میرے خوشی کے آنسو نکلے آ رہے ہیں، روپ کی شادی جو ہے نا۔ میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی ہے۔"

"اوہ، ہاں بھئی تم سے زیادہ کون خوش ہوگا آج۔" بابو جی کچھ نہ سمجھتے ہوئے خوش ہو کر بولے۔

ماں جی خوشی سے پھولی سمائی اندر اہتمام میں اس قدر مصروف تھیں کہ سارا گھر انھوں نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ دور دور سے مہمان آئے تھے۔ ویسے محلے کے لوگ بھی کچھ کم نہ تھے۔ پورا بنگلہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آس پاس معزز مہمانوں کے لیے صوفے کرسیاں وغیرہ بچھی تھیں۔ دن ڈھلے ہگلی ماتھر، بوس، نرلیش اور یونیورسٹی کے دوسرے ساتھی جنھیں چٹرجی نے روپ کی طرف سے دعوت دی تھی، آ پہنچے۔ آسام میں اپنی رضاکارانہ خدمات کا عرصہ پورا کر کے چند ہفتے قبل وہ سب لوٹ آئے تھے۔ دو ایک بار اس دوران میں ان میں سے بعض لڑکے روپ اور چٹرجی سے ملنے بھی آئے، لیکن پنڈت پرکاش چندر کا بنگلہ شہر کے سرے پر تھا، اس لیے فاصلے کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ آتے جاتے نہ تھے اور پھر روپ کی تنہائی پسندی بھی اس میل ملاپ میں حائل رہتی۔ مگر اس سے انسیت سب ہی رکھتے تھے۔

Akram Allahabadi

ہنگلی ناتھ نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ کمبخت کہیں چپکا رہنا ہی نہ جانتا تھا۔ دور سے ہی چٹر جی کو دیکھ کر آواز دی۔

"اے، میرے چٹر پٹر جی، تھوڑا چٹ پٹا لاؤ۔ دیکھو ہم مہمان آئے ہیں۔"

لیکن چٹر جی اس وقت مصروفیت کے علاوہ اپنے گھٹتے ہوئے جذبات کے ہاتھوں اس قدر خاموش تھا کہ اس نے ہنگلی ناتھ کو جواب بھی نہ دیا۔ فقط ایک پھیکی اور فرضی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

"یہ لو، یہ تو ایسا سمجھ رہا ہے جیسے ہم لوگ کسی اناتھ آشرم کا چندہ مانگنے آئے ہوں۔"

ہنگلی ناتھ نے بوڑھی عورتوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ مٹکا کر کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اے جناب، الوکی دم فاختہ صاحب، یہ شادی بیاہ کا گھر ہے، ذرا اپنی چونچ بند رکھیے۔" بوس نے پیچھے سے ہنگلی کو ڈانٹا۔

"ہونہہ، جیسے دولہا کا باپ یہی ہو۔ شریف آدمی تیری کون سی ناک کٹی جا رہی ہے جو نائیں نائیں کرتا ہے۔" ہنگلی نے برا سا منہ بنا کر اسے جواب دیا۔

"بھگوان قسم اسے تو کسی چمار کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔" بوس نے ہنگلی ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے یہ کہہ کر رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ہونا تو یہی چاہیے تھا۔" نریش نے بھی سنجیدگی سے سانس کھینچ کر کہا۔ وہ اپنی مسکراہٹ کو دبائے ہوئے تھا۔

"اخاہ ہینڈ کی راز کام پیدا شد۔ لو آپ بھی بولے۔" ہنگلی ناتھ نریش کی طرف گھوم پڑا۔

"نہیں بھائی، میں نے چلغوزے نہیں کھائے ہیں۔ مجھ سے مت جھگڑ بابا۔" نریش اس کے سامنے مسکین صورت بنا کر ہاتھ جوڑنے لگا۔

"اچھا جاؤ معاف کیا۔" ہنگلی نے فراخدلی دکھلائی۔

Akram Allahabadi

"ارے اب لڑتے رہو گے یا چل کر روپ کو مبارک باد بھی دے دیں۔" چوتھے ساتھی جتیندر نے رائے دی۔

"کیا ہم کوئی نیوتے پر آئی ہوئی پڑوسنیں ہیں جو دولہا کو مبارکباد دینا ضروری ہے، دیدیں گے، ہیرے پھیروں کے بعد، جلدی کیا ہے۔" بوس نے اس کی تردید کر دی۔

"اے بوس، دیکھ وہ شریمتی جی کتنی خوبصورت ہیں۔" ہنگلی نے ایک مہمان لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو سلک کی پیازی ساڑی میں ملبوس اپنے کسی عزیز کے ساتھ ایک طرف کرسی پر بیٹھی تھی۔

"یہ یونیورسٹی نہیں بیٹا، اتنے جوتے پڑیں گے کہ بھیجا لپلپا ہو جائے گا۔" نریش نے بغل سے جواب دیا۔

"ارے واہ، میں تعریف ہی تو کر رہا ہوں، چندر۔ خوبصورتی کی تعریف نہ کرنا انتہائی بد اخلاقی کی دلیل ہے۔" ہنگلی نے اپنی معصوم صورت بنا کر کہا کہ سب ہنس پڑے۔

"روپ کو کوئی سمجھ نہ سکا کہ وہ کس موڈ میں ہے۔ چند دنوں سے وہ بالکل ہی خاموش سا تھا۔ اسے جیسے ان تیاریوں سے، ان آنے والی ساعتوں سے کوئی لگاؤ، کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن چٹرجی نے اس شادی کے موقع پر زیادہ سے زیادہ رونق و آسائش فراہم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ پچھلے دو دنوں سے تو وہ بغیر کسی آرام کے ان ہی انتظامات میں مصروف رہا تھا اور آج کافی تھکا ہوا اور نڈھال ہونے کے باوجود صبح سے چہرے پر ایک گہری خاموشی لپیٹے مہمانوں کے استقبال اور بارات کے انتظام میں لگا رہا۔

پنڈت پرکاش چندر کی زرد بیوک کار کو پھولوں سے لاد دیا گیا تھا۔ بارات کا پروگرام یہ تھا کہ گھر سے نکل کر محلے کا چکر کاٹتی ہوئی پھر گھر پر آ کر ختم ہو جائے گی۔ یہ ایک رسم بھی تھی اور ماں جی کا ارمان بھی۔

لگن منڈپ کی داہنی طرف مہمان عورتیں تھیں اور بائیں سمت مرد۔ آخر وہ وقت بھی

آ پہنچا جب دولہا منڈپ میں آ بیٹھا اور دلہن کو بھی لے آیا گیا۔

وہ پھولوں سے لدی ہوئی تھی اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ چڑ جی جواب تک ایک مضبوط چٹان کی طرح زندگی کے اس اندوہناک طوفان کے تھپیڑے سہے جا رہا تھا، ایسے وقت سامنے کھڑا نہ ہو سکا اور منڈپ کے پیچھے جا کر ایک کھمبے سے، نیم مردہ، بے سکت سا، ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ لاکھ کوشش کے باوجود اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک پڑے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کلیجہ پھٹا جا رہا ہو۔ اور اس ڈر سے کہ مبادا پیر کانپ جائیں اور وہ گر پڑے، وہ کھمبے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف اس خوبصورت جوڑے پر تبصرے ہو رہے تھے۔

لیکن روپ کا چہرہ زرد تھا۔ وہ اس وقت پہلے جیسی پرسکون کیفیت میں نہ تھا۔ برہمن نے اشلوک پڑھ کر گنگا جل اگنی پر ڈالنا شروع کیا۔ اب پھیرے شروع ہونے والے تھے۔ اور آخری انجام کے ایک ایک سیکنڈ پر چڑ جی کے دل کی دھڑکنیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ روپ نے ایک بار جھکی ہوئی پریشان نظریں اٹھائیں۔ سرسری نظر سے وہ مہمانوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نگاہیں اس طرح گھومتی ہوئی مہمان عورتوں کے چہروں سے گزرنے لگیں۔ غیر ارادی طور پر بس یونہی۔ اچانک وہ چونک پڑا۔ نگاہیں کہیں گڑ گئیں۔

کھڑی ہوئی عورتوں کے درمیان اسے ایک خوبصورت چہرہ نظر آیا جو اس وقت زرد معلوم ہو رہا تھا۔

"اوشا۔" وہ دبے لہجے میں چیخا۔ پھر گھبرا کر اس نے اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ دوبارہ دیکھا۔ وہ اس وقت بھی موجود تھی۔ اس کی بڑی بڑی اور گھنیری سیاہ پلکوں والی آنکھوں سے آنسوؤں کی چمکدار بوندیں ڈھلک کر اس کے رخساروں پر چمک رہی تھیں۔

"اوشا۔" وہ زور سے چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اپنا سہرا اور مکٹ وغیرہ نوچ کر پھینکتا ہوا ان عورتوں کی طرف دوڑا، جہاں اوشا اسے نظر آئی تھی۔ لوگ گھبرا کر اٹھ

کھڑے ہوئے ہر طرف سے حیران نگاہیں اسے گھورنے لگیں اور تبصرے شروع ہو گئے۔
چٹر جی بھی اپنی جگہ چونک پڑا۔

روپ مردوں کے درمیان سے نکلتا ہوا عورتوں کے نزدیک پہنچ گیا، مگر وہ اب وہاں نہ تھی۔ اس جگہ کوئی بھی ویسی لڑکی، ویسا چہرہ نہ تھا۔ عورتوں کے پیچھے ادھر ادھر گھبرا گھبرا کر ڈھونڈتا رہا اور تمام عورتیں انگلیاں دانتوں میں دبائے اسے حیرت سے دیکھتی رہیں۔

"روپ۔" بابو جی کی گرج دار آواز دور سے سنائی دی۔ وہ ہوشیار ہو گیا۔ اسے اوشا نہ ملی۔ حالانکہ اس نے اچھی طرح آنکھیں مل کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ایک منٹ پہلے یہاں موجود تھی۔ مگر روح جو ٹھہری۔ وہ جس طرح اچانک کہیں پہنچ سکتی ہے، اسی طرح وہ اچانک نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتی ہے۔ اوشا کی روح کا سفید سا آنسوؤں میں غلطاں چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

اس کی کیفیت اس وقت اس پاگل جیسی ہو رہی تھی جو ساری دنیا کو ٹھوکر مار کر صرف کسی ایک چیز، ایک مقصد کی جستجو کر رہا ہو۔ بابو جی کی آواز کو سنی ان سنی کر کے وہ اوشا، اوشا، چیختا ہوا عورتوں کے درمیان سے گزر کر دروازے پر کھڑے ہوئے نوکر کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا۔ پیلے رنگ کی بیوک کار پھولوں سے لدی دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ جانتا تھا۔ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس نے فوراً کار اسٹارٹ کر دی۔ اور جب تک حیران مہمانوں کی بھیڑ کو چیر کر پنڈت پرکاش چندرا اور چٹر جی دروازے پر پہنچیں، اس کی کار بہت دور جا چکی تھی۔
پنڈت جی سر پکڑ کر رہ گئے۔

پنڈتائن (ماں جی) بھی چھاتی پیٹتی ہائے ہائے کرتی دروازے تک آ گئی تھیں۔

"اب کیا ہوگا؟" وہ بولیں۔ "لوگ کیا کہیں گے؟ مہمان جو آ چکے ہیں؟" آواز ان کے حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہوگا کیا، شادی ہوگی اور ابھی ہوگی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

Akram Allahabadi

"کس سے؟" حیرت سے ماں جی کا منہ پھیل کر سوالیہ نشان بن گیا۔

"چٹر جی سے۔ نیلا کو اب میں اس پاگل کے حوالے نہ ہونے دوں گا۔" اس نے فیصلہ کن اور سخت لہجے میں بیوی سے کہا۔

"ہاں، ہاں ٹھیک تو ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ گھبرا کر بولیں۔ "مگر روپ جو.."

"اسے جہاں جانا چاہیے تھا، وہاں گیا۔" بابو جی بولے۔

اتنے میں پیچھے سے چٹر جی کوٹ پہنے سامنے آ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" بابو جی نے اسے روک دیا۔

"روپ کو واپس لانے۔" چٹر جی نے جلدی میں جواب دیا۔

"نہیں، اسے جانے دو۔ اس کا پیچھا کرنے سے ممکن ہے ہم اس سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اس کے سر آسیبیت کا جنون سوار ہے۔ زیادہ پریشان کیا گیا تو وہ خودکشی کر لے گا۔" باپ نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے چٹر جی کو روپ کے پیچھے جانے سے منع کر دیا۔

"لیکن...؟" چٹر جی نے کہنا چاہا۔

"کچھ سوچنے کا وقت نہیں، مہمان موجود ہیں۔ غریب نیلا کی زندگی لوگوں کی بدگمانیوں کا شکار ہو جائے گی۔ اس وقت ہمدردی کی مستحق وہ ہے۔" بابو جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟" چٹر جی نے پوچھا۔

"نیلا کی شادی آج ہو کر رہے گی۔" بابو جی نے اپنا فیصلہ دہرایا۔

"مگر کس سے؟" چٹر جی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"تم سے۔" بابو جی نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہ کرو گے۔"

وہ چٹر جی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھنے لگے۔

چٹر جی کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کے لیے تبدیل ہو گئی، مگر فوراً ہی اس نے خود

Akram Allahabadi

پر قابو پالیا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" چتر جی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی پلکیں نمناک ہو گئیں۔ مگر اس بار یہ ضبطِ غم کے آنسو نہ تھے، یہ اس خوشی کے آنسو تھے، جس کے لیے زندگی ترس گئی تھی۔ سب کچھ اچانک اور ایک خواب کی طرح ہو گیا۔ چند منٹ پہلے جسے وہ ہمیشہ کے لیے کھوئے دے رہا تھا، اب وہی اسے ہمیشہ کے لیے مل گئی۔

اور پھیروں کے بعد جس وقت ہار پہناتے ہوئے بظاہر شرم اور درحقیقت ایک مسلسل غم آگیں انہماک میں ڈوبی ہوئی نیلا نے اپنے پتی کی صورت دیکھی تو اس کے چہرے کی زردی ایک دم سرخی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی اداس نگاہیں چمک اٹھیں اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ محبت کو نئی زندگی مل گئی تھی۔

"آپ..." اس نے اپنی چیخ کو تقریباً دبا کر شرم سے سر جھکا لیا۔

☆☆☆☆☆☆

شادی کے بعد لگن منڈپ سے باہر نکلتے ہوئے ہنگی ناتھ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہے پرمیشور، ایسے ہی بوس بھی اپنی شادی کے وقت پاگل ہو کر بھاگ جائے اور میں اس کی منگیتر سے شادی کرلوں۔"

بوس پیچھے سے ہنس کر بولا۔ "مگر میری منگیتر تو تیری..."

"چل ہٹ۔" ہنگی زور سے اچھل پڑا۔ "بہن ہو گی تیری۔ میری تو سات پشت میں کوئی بہن نہیں ہوئی۔"

"ارے بھئی فرض کرلو نا۔" نریش بیچ میں کود پڑا۔

"ہاں بھئی، ایسی باتیں فرض کرلی جاتی ہیں۔ فرض کرلو کہ میں تمہارا جیجا جی ہوں۔" بوس نے ہنستے ہوئے دبے لہجے میں کہا۔

Akram Allahabadi

"ہونہہ، کون شریف آدمی اس شکل وصورت پر تجھے بیٹی دے گا۔ سالا بلیک جاپان۔" ہنگی نے موڈ بدلتے ہوئے بوس کی شخصیت پر تبصرہ کیا۔

"تیرے رشتے میں ایسے بہت ہیں۔" بوس نے ویسا ہی جواب دیا۔ اتنے میں دوسری طرف سے بابو جی آتے نظر آئے تو سب خاموشی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆☆☆☆

گاڑی کو اسٹیشن کے باہر چھوڑ کر جب روپ پاگلوں جیسی جذباتی کیفیت میں شیروانی کے بٹن کھولے، چہرے پر بال بکھرائے، سرخ آنکھیں لیے پلیٹ فارم پر پہنچا تو ایک اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت آسام جانے والی ٹرین تیار تھی۔ وہ ٹکٹ لیے بغیر ہی اس دیوانگی کے عالم میں دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا۔ اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ دل جیسے سینے سے نکلا پڑ رہا تھا۔ اوشا کی روح جسے کلکتہ کے اس زندان نما ماحول، نیلا کی قربت اور اثر اندازی، چٹرجی کی پیہم نفسیاتی نصیحتوں اور گھر کے لوگوں کی خوشگوار صحبتوں میں وہ ایک یادِ ماضی کی طرح نظر انداز کر گیا تھا، درحقیقت اس کے دل سے بالکل دور نہ ہوئی تھی۔ اس کی محبت جو روپ کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی، حالات کے نفسیاتی اثر سے دب ضرور گئی تھی، لیکن اس کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ وہ جس وقت ابھری، روپ کا گیا ہوا جذباتی بہاؤ لوٹ آیا۔ اسے وہ سب کچھ یاد آ گیا جو وہ بھول چکا تھا۔ وہ موت کا شہر، وہ بھیانک اور آسیبی کھنڈر، وہ اوشا کی روح سے ملاقاتیں، ایک لاہوتی ہستی سے محبت وفا کی باتیں۔ وہ اسی ڈراؤنی سیاہ ویرانی رات سہانی روح کی کیفیتیں۔ ان تمام یادوں نے اس کی شعورِ تحتی سے ابھر کر اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ آج وہ پھر اتنا ہی پاگل نظر آ رہا تھا، جس قدر اس رات اس کھنڈر میں تھا۔ اور اگر چٹرجی نے بار بار اسے یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کی ہوتی کہ ان کا وجود صحیح بھی سمجھ لو تو روحیں کبھی نہ مل سکے گی اور ویسا ہو چکا ہے۔ اب وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔ پھر ایک بھی نہ

ملنے والی چیز کے لیے جان ہلکان کرنے سے فائدہ۔

شاید اسی وجہ سے وہ اسے بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے ماں جی کی ضد اور نیلا کی عزت کی خاطر اپنی محبت اور خوشیوں کی قربانی دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ لیکن آج وہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ یقیناً وہ اسے بھولی نہیں۔ عالمِ بالا کی ایک پاکیزہ روح دنیا والوں کی طرح فنا ہو جانے والی یا بدل جانے والی محبت کسی سے نہیں کر سکتی، نہ جانے وہ کس طرح آ سکی ہو گی۔ مگر وہ آئی ضرور تھی۔ اور اسے دیکھ کر روپ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا وہ لوٹ آئی ہے۔ اب وہ اسے اس کھنڈر میں ضرور ملے گا۔ اور اس خیال کے ساتھ اس کا دل اس قدر مضطرب ہو جاتا تھا کہ بس چلے تو اڑ کر ڈیرہ وگڑھ پہنچ جائے۔ کاش وہ کوئی ہوائی جہاز ہوتا۔ مگر ہوائی جہاز ہوتا تو اس سے محبت کیسے کرتا؟ نہیں تو ڈیرہ وگڑھ میں مویشیوں کی مردہ لاشوں پر اڑنے والی کوئی چیل ہوتی...

ہشت، کتنی گھناؤنی آرزو۔ وہ اپنے آپ پر ہی لعنت بھیجنے لگا۔ ایک اتنی پاکیزہ شے سے ملنے کا تصور اور اتنی احمقانہ آرزوئیں۔ وہ سر جھٹک کر سیکنڈ کلاس بوتھ پر پیچھے کی طرف ٹک گیا اور ٹرین چلتی رہی۔ ہوا کا سینہ چیرتی ہوئی دندناتی شور مچاتی۔ اور آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر کسی بہت گہرے تصور میں کھوئے ہوئے اس پریشان صورت نوجوان کو عجیب عجیب نظروں سے گھورتے رہے۔

اسے اپنے آپ پر شرمندگی کے ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے ایسی بے وفائی کیوں کی اس کے ساتھ۔ کیا وہ اسے معاف کر سکے گی؟ لیکن اس نے خود تو ایسا نہ کیا تھا۔ وہ بے بس تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ڈیرہ وگڑھ پہنچ کر اس نے دیکھا وہ جگہ جہاں ان کا کیمپ تھا، ستھرے میدان کی طرح

Akram Allahabadi

کھلی اور ویران پڑی تھی۔ سویلین رضا کار اپنے اپنے مقامات کو واپس لوٹ چکے تھے، جو رہ گئے تھے، وہ دور دراز کے علاقوں میں ابھی کام کر رہے تھے۔ اس کیمپ کو توڑ دیا گیا تھا۔ فوجی رضا کار آسام کے شمالی مشرقی علاقوں کی طرف تبدیل کر دیے گئے تھے۔ البتہ اس مقام سے کچھ آگے برباد شدہ علاقے کے کسی قبیلے نے اپنی جھونپڑیاں ڈال لی تھیں۔ روپ اس طرف سے ہوتا ہوا شام گڑھ کے راستے والے اس چار چھ جھونپڑیوں کے ٹکڑے والے گاؤں میں پہنچ گیا، جہاں وہ بوڑھا قبائلی رہتا تھا، جس کے یہاں روپ ایک بار پہلے ٹھہرا تھا۔

بوڑھے قبائلی نے جو اسے دیکھا تو اس کے خوشی سے آنسو نکل آئے۔ روپ اس کی امیدوں کا سہارا تھا۔ اس سے پیٹ کے لیے دو چار روپے مل جاتے تھے۔

"بابو، تم آگئے، میرا دل بولتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔" خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں قبائلی نے کہا۔

"کیوں، بابا؟" روپ نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"دل کو دل سے راہ جو ہوتی ہے۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ میں تمھیں دل میں بیٹا ہی سمجھنے لگا، بابو۔" بوڑھا اپنے جذبات کو چھپا نہ سکا۔ اور روپ بھی اس صداقت سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکا۔

"دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔" روپ نے دہرایا اور اس کی آوارہ نگاہیں دور پڑے ہوئے اس ویران خلا کو گھورنے لگیں جس کے پیچھے اس موت کے شہر کے آثار چھپے ہوئے تھے۔ اس کا دل بے چین ہو گیا۔

"کیسے نہ آتا، بابا۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" اس نے دور کھڑے پہاڑی سلسلے کی طرف نظریں جما کر کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" بوڑھے نے ہنس کر سر ہلایا۔ "مگر بابو، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں اس طرف کہیں تمہارا کچھ کھو گیا ہے تب ہی ان ویرانوں میں بھٹکتے رہتے

Akram Allahabadi

ہو۔‘‘ روپ اس کے اس جملے پر چونک پڑا۔

’’تم نے ٹھیک کہا، بابا۔ کچھ نہیں بہت کچھ کھو گیا ہے۔ سب کچھ کھو گیا ہے۔ میں اسی کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔‘‘ وہ جذبات سے متاثر لہجے میں بولا۔

’’لگن سچی ہو تو پرماتما بھی مل جاتا ہے، بیٹا۔ چیز تو چیز ہی ہے۔‘‘ بوڑھے نے اپنی دانست میں بڑے بوڑھوں کا بہت قیمتی فلسفہ بیان کیا۔

’’لگن؟ لگن کا تو سوال ہی نہیں۔ یہاں تو موت و زندگی کا معاملہ ہے۔‘‘ روپ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ شدتِ احساس کے غلبے سے وہ اکثر بلا روک ٹوک بڑبڑانے لگتا۔

’’موت اور زندگی؟‘‘ بوڑھا سوچ میں پڑ گیا جیسے یہ کوئی معمہ ہو اور وہ اسے اپنے تھکے ہوئے ذہن میں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

’’تم نہ سمجھو گے، بابا۔ اور یہ کسی کے سمجھنے کی بات بھی نہیں۔ ایک علیحدہ چیز ہے، ایک بالکل علیحدہ الجھن، جس کا کسی کی ہمدردی، کسی کے سہارے سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘ روپ نے اپنی سنجیدگی میں ایک خفیف سی تھکی ہوئی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔

’’سچ۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔‘‘ بوڑھا بھی معصومیت کے ساتھ سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

’’کہیں سگریٹ ملے گی، بابا؟‘‘ روپ نے اس سے سوال کیا۔

’’سگریٹ؟ یہاں ان اجاڑ علاقوں میں؟ حقہ شاید مل جائے، وہ بھی ایک بوڑھا ہے جو میری طرح بنارس گیا تھا تیرتھ یاترا کے لیے اور وہاں سے حقہ پینا سیکھ آیا تھا۔ کہو تو جا کے پوچھوں؟‘‘ بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔

’’نہیں رہنے دو۔ کہیں سے تھوڑا سا دودھ لا دو، مجھے کچھ بھوک لگ رہی ہے۔‘‘ روپ نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اس سے فرمائش کی۔

Akram Allahabadi

"ہاں دودھ لیے آتا ہوں۔ میں تو خود سوچ رہا تھا کہ تمہارے کھانے کے لیے کچھ تیار کروں، مگر برا ہو اس غریبی کا، دو پیسے بھی پاس نہیں رہتے۔" وہ اداس ہو کر بولا۔

"اوہ۔" روپ چونک پڑا، جیسے یہ اہم مسئلہ تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ "یہ لو، رکھو اپنے پاس۔ اس کا غم میرے ہوتے ہوئے تمہیں نہ ہونا چاہیے۔" اس نے جیب سے اپنا پرس نکال کر بوڑھے کے حوالے کر دیا۔ بوڑھے نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں بہت سے نوٹ بھرے تھے۔ اس کے چہرے پر سرخ لکیریں دوڑ گئیں۔ بوڑھاپے کے جھریوں میں تھرتھری سی پیدا ہوگئی۔ وہ خوشی سے مسکرا دیا۔

"مگر اتنے بہت سے؟" وہ اٹک کر بولا۔

"لے لو۔ مجھے جب ضرورت ہوگی لے لیا کروں گا۔" روپ نے لاپرواہی سے کہا۔ اور بوڑھے نے اس میں سے ایک روپیہ نکال کر بٹوے کو بڑی احتیاط سے پھٹی ہوئی صدری کی اندر کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ ایک مٹی کی ہنڈیا ہاتھ میں لے کر چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

یہ رات روپ کے لیے اس چھوٹی سی قبائلی بستی کے اس چھوٹے سے پھوس کے نیم تاریک جھونپڑے میں بھی تنہائی اور سکون کی وجہ سے بے لطف نہ ہوئی، لیکن دل کی بے چینی نے اس کے لیے اس رات کا ایک ایک لمحہ اذیت زدہ بنا دیا تھا۔ کاش صبح ابھی ہو جاتی۔ باہر جھونپڑوں کے آس پاس پھیلی ہوئی جنگلی جھاڑیوں سے جھینگروں کی مشترک آوازیں پرسکوت فضا میں ایک بے کیف سا دھم شور مچاتی سنائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں ویران کھنڈروں کی اس بستی میں سیار اپنی بے ترتیب ہواں ہوں کے نغمے الاپ رہے تھے اور آسمان پر گہری تاریکی مسلط تھی۔ روپ نیچے گھاس بچھائے ہوئے چٹائی کے بستر پر کمرے کے ایک کونے میں لیٹا چھت کو تک رہا تھا اور بوڑھا دوسرے کونے میں ایک پھٹے سے بوریے پر مڑے ہوئے چاقو کی

شکل میں سمٹا پڑا گہری نیند کے خراٹے لے رہا تھا۔
آخر سفر کی تکان اور تخیل میں امکانی خوش آئندہ تصورات کی رواس پر نیند لے آئی اور وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔
صبح دن چڑھتے ہی وہ موت کے شہر کی طرف چل پڑا۔ بوڑھے نے کھانے کے لیے پوچھا بھی کہ کب تک لوٹو گے بابو؟
مگر وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ میرا انتظار مت کرنا، آ گیا تو کھالوں گا، نہیں تو فکر کی ضرورت نہیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

کیمپ والے ویران میدان سے گزرتے اسے یہاں بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ دل مسوس کر آگے بڑھتا ہوا وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھنے لگا۔ ابھی ۹ ہی بجے تھے۔ خشک نالے کو پار کر کے، وڑی ہوئی سڑکوں کو عبور کرتا ہوا، وہ آخر موت کے شہر کی حدود میں داخل ہو گیا، جہاں ویران اور اداس کھنڈر اب بھی اپنی بھیانک خموشی کے ساتھ میدانِ جنگ میں شہید ہو جانے والے سپاہیوں کی بے ترتیب لاشوں کی طرح بکھرے پڑے تھے اور موت کا سا سنسنی خیز سکوت آسیبیت کے انداز سے بکھر رہا تھا۔ آج یہ جگہ اسے پہلے سے بھی پر ہول اور اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ کتنے عرصے کے بعد وہ لوٹ کر آیا تھا ان کھنڈروں میں جن کی اداسی اب بوڑھی ہو کر مستقل ہو چکی تھی۔ گرے پڑے درختوں کے خشک ڈھانچوں اور کھنڈروں میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے مکڑی کے جالوں کے علاوہ اب بھی کہیں کسی ملبے کے ڈھیر سے زمین کے کسی شگاف میں کچھ انسانی ہڈیاں، کوئی کھوپڑی، کچھ نشانات بھی ایسے نظر آ رہے تھے جنھیں دیکھ کر دل بری طرح خوف سے لرز اٹھتا۔ پرانے کھنڈر اور پرانے قبرستان دونوں زیادہ پر ہول معلوم ہوتے ہیں اور ایک جگہ تو وحشت سے وہ اچھل پڑا جب ایک کھنڈر کے نزدیک مٹی پتھر کے ڈھیر پر سے گزرتے

ہوئے اچانک اس کا پاؤں ایک مردہ انسانی ڈھانچے پر پڑ گیا جو اسی ڈھیر میں دبا ہوا ادھر ادھر سے جھانک رہا تھا۔ وہ کانپ کر ایک طرف کو کود گیا۔

زلزلے کی قیامت سے زندہ مٹی میں مل جانے والے اس ان جانے آدمی کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں اب تک ایک پیر کے پنجے کی ہڈیوں پر ایک چمڑے کا جوتا الجھا ہوا تھا۔ شاید وہ دوڑتے میں اس موت کا شکار ہو گیا ہو۔ کچھ بھی ہو، روپ انسان ہی تھا۔ لاکھ مضبوط دل رکھتے ہوئے بھی وہ اس طرح کھنڈروں کے تودوں میں دب کر مر جانے والے ہزاروں مردوں کی آوارہ روحوں کی موجودگی کے خوف کو آسانی سے بھلا نہ سکا۔ اگر محبت کو جنون اسے ایک بے بس پتلے کی طرح اس ویران کھنڈروں کی طرف نہ کھینچ رہا ہوتا، جہاں اس کی امید کے مطابق اوشا کی روح سس کی منتظر ہوگی تو وہ شاید اس سے خوفزدہ ہو کر لوٹ جاتا۔

لیکن ان ہی روحوں میں سے ایک خوبصورت روح سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتے ہوئے فرار کیا معنی۔ انجام موت ہی تو ہوسکتا ہے اور موت شاید ان کے درمیان سے دوئی کے پردے اٹھا دے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔

اور اس زمین پر لیٹے ہوئے برگد کے بوڑھے درخت کے نزدیک ایک دھنسی ہوئی چٹان کے سرے پر رک کر اس نے جب گھڑی دیکھی تو ابھی صرف ۱۰ بجے تھے۔ دوپہر کی زرد رومانیت کو پھیلنے کے لیے ابھی کافی وقت باقی تھا جب وہ اس شہر خموشاں کی طرف آیا کرتی تھی۔

کھنڈر میں داخل ہوتے ہوئے اوشا کی روح کے آنکھوں میں کھنچے ہوئے تصور کے ساتھ ساتھ وہ پچھلی ملاقاتیں یاد آتی گئیں، جب ان کی اس عجیب اور آسیبی محبت نے ایک دوسرے سے کچھ وعدے کیے تھے۔ کچھ اقرار، محبت کے، استحکام اور وفا کی انتہا کے۔ مگر خود وہ ہی تو مجرم تھا اپنی نظر میں۔ ایک روح، ایک لاہوتی ہستی۔ اپنی جگہ اپنے غیر فانی وجود کی طرح غیر فانی اور مستقل ہوتی ہے۔ اس کے اقرار، اس کے الفاظ کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتے، لیکن زندہ

Akram Allahabadi

رہتے ہوئے انسان کے لیے ہر وعدے کو نبھا دینا بہت مشکل ہے۔ وہ اس دنیا میں رہتا ہے جہاں سب کام، سب ارادے اس کے اپنے یقین و عمل پر ہی منحصر نہیں، ان میں دوسروں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ ان پر وقت اور زمانہ بھی حاوی ہوتا ہے۔ ان پر ماحول اور مجبوریاں بھی مسلط ہو جاتی ہیں۔ پھر کیا وہ بھی بے قصور نہیں کہ سب کچھ اسے مجبور کر کے ہوا۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اس کھنڈر کو چھوڑ کر چلا جائے، جہاں اس کی زندگی کا سکون دفن تھا۔ جہاں خود اس کی روح خوابوں کی دنیا میں بھری ہوئی اوشا کی روح کے لیے بھٹکتی رہتی تھی۔ یہ ناممکن العمل سہی کہ اوشا زندگی میں تبدیل ہو سکے۔ یہ ناممکن العمل سہی کہ ایک زندہ ہستی اور ایک مرے ہوئے وجود کی روح کی محبت کا کوئی خوشگوار انجام نہ ہو، مگر وہ اس سے والہانہ محبت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ شعور و تحت الشعور سے لے کر اس کی رگ و پے میں اوشا کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ وہ اس خوبصورت سفید لاہوتی پیکر کو بھول ہی نہ سکتا تھا، جسے بلانے کے لیے اسے کلکتے کے مقید ماحول نے رسمی، اخلاقی اور نفسیاتی دباؤ کے علاوہ ماں کی ضد سے متاثر کرنا چاہا تھا اور جذباتی طور پر وہ دوسروں کی ضد اور دوسروں کی خوشی پر قربان ہو جانے والے انسان کی طرح اپنا سب کچھ لٹا دینے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اوشا کی روح خود ہی اسے اس قید سے نکال لائی۔ اسے دیکھ کر روپ کے دل میں دبی ہوئی محبت کا طوفان جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا اور آتش فشاں جب پھٹتا ہے تو کسی کے روکے نہیں رکتا۔ جیسے اسے کوئی دوبارہ ان ویران کھنڈروں تک پہنچنے سے کوئی نہ روک سکا تھا۔

"وہ نہیں آئی۔" روپ بھاری آواز میں کلائی کی گھڑی دیکھ کر بڑبڑایا۔ کھنڈر کے اندرونی دالان کی نیم شکستہ دیوار سے ٹکا ہوا وہ دیر سے کھڑا یہی سب سوچ رہا تھا۔ اب ساڑھے 11 بج چکے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"کہیں وہ اب بھی ناراض تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی ہم اب کبھی نہ مل سکیں؟ نہیں بھگوان، ایسا نہ کرنا۔" وہ آپ ہی بڑبڑاتے ہوئے درد سے چیخ اٹھا۔ اس کے دکھتے

Akram Allahabadi

ہوئے دل کا اس وقت برا حال ہو رہا تھا۔ بار بار اس کی پریشان نگاہیں ہوا کی ہر سرسراہٹ پر آس پاس کی ذرا سی کھڑکھڑاہٹ سے ادرگرد دیکھنے لگتیں کہ شاید وہی نہ ہو۔

لیکن سورج آخر ۹۰ ڈگری پر پہنچ گیا اور سائے مختصر ہوتے ہوئے قدموں میں سمٹ آئے، مگر وہ نہیں آئی۔ روپ دونوں مٹھیاں زور سے بھینچ کر نڈھال سا ملبے کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

''اوشا...'' وہ دبی سانس کے ساتھ آہستہ سے چیخا۔ ''ایشور کے لیے آجاؤ۔ میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔ مجھے معاف کردو، اوشا۔ میری اوا س زندگی سے اس طرح نہ کھیلو۔''

مگر کوئی سننے والا تھا نہ جواب دینے والا۔ شگافوں سے سنسناتے ہوئے گزرنے والے ہوا کے آوارہ جھونکے اس کی ٹھنڈی سانسوں کو سمیٹتے ہوئے اس کی اس درد میں دبی آواز کو اٹھا لے گئے اور نہ جانے کہاں پھینک دیا۔ وہ دل کی پریشان دھڑکنوں کو دبائے بار بار اٹھنے، ٹہلنے اور بیٹھنے لگا۔

اور پھر ساڑھے ۱۲ بج گئے، مگر اوشا کی روح کی آمد کا کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہ تھا۔ روپ کی آنکھوں میں امید کے چمکتے دیے بجھنے لگے۔ یہ قبل از وقت تصورات کہ وہ آئے گی تو یوں کہوں گا، اس طرح اس سے اپنی مجبوریوں کی معافی مانگوں گا، اسے اپنی بے گناہی کا قائل کروں گا۔ مایوسیوں میں ڈوبتے ڈوبتے یادداشت کے ان خانوں میں محفوظ ہو گئے جہاں کے ایسے ان گنت ارمانوں، بے شمار اراددوں اور لاتعداد امیدوں کی قبریں پہلے ہی سے کھدی رہتی کیونکہ ہر امکان کا برعکس پہلو اس کے ساتھ ہی دل و دماغ میں جنم لیا کرتا ہے۔

وہ تقریباً مایوس ہوا جارہا تھا اور یہ مایوسی اس کے لیے بہت اذیت دہ تھی۔ دالان کی شکستہ وسعتوں سے گزر کر ایک بار وہ پچھلے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں بڑی بڑی مکڑیوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے جالے تان رکھے تھے اور کمرے کے اندھیرے کونے ان میں چھپ کر رہ گئے تھے۔

اس کا اضطراب قابو سے باہر ہورہا تھا۔ جی چاہتا تھا منہ بسور کر رو پڑے۔ ایسا بھی

تڑپاتا کیا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگے۔ اسی طرح پریشان ٹہلتا ہوا وہ پھر دالان میں لوٹ آیا اور غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس شکستہ زینے کی طرف اٹھ گئے جو اوپر تک جا کر شکستہ چھت کے کنارے ختم ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ یوں ہی کھویا ہوا سا اس پر چڑھتا گیا۔

سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ کر جب اس نے چاروں طرف نظر پھیلائی تو اسے پورا موت کا شہر دور تک زمین پر پھیلا نظر آیا۔ البتہ شمال مغربی سمت میں ڈھلوان چٹانیں پرت در پرت زمین پر بچھی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض زلزلے کے شدید جھٹکوں سے درک گئی تھیں۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی نظریں دور کسی شے پر جم کر رہ گئیں۔

سفید لہراتے ہوئے آنچل کی طرح ایک سایہ بہت دوران ڈھلوان نما چٹانوں پر ہوتا ہوا پہاڑوں کے شمال مغربی سلسلے کی طرف جا رہا تھا۔ بالکل وہی انداز خرام، وہی لباس۔

"اوشا..." وہ پوری طاقت سے گلا پھاڑ کر چیخا۔ اور دور تک ویران چٹانوں میں اس کی آواز پھیل گئی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ جانے والا اسے سن لیتا۔ وہ دوبارہ چیخ۔ "اوشا... میں آ گیا۔ اوشا..." لیکن اس نے نہیں سنا۔ وہ اسی انداز سے ڈھلوان پر آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

روپ گھبرا کر سیڑھیوں سے تیز تیز اترتا ہوا کھنڈر سے نکل کر بھاگا۔ ٹیلے سے اترتے ہوئے وہ ایک جگہ گرتے گرتے بچا، مگر اس وقت اسے کچھ پرواہ نہ تھی۔ اس کے باوجود کہ اس ٹھوکر سے اس کے پیر میں موچ سی آ گئی تھی، لیکن جذبات کی گرم جوشی نے اسے ذرا سی تکلیف محسوس نہ ہونے دی۔ وہ تیزی سے درمیانی کھنڈروں اور ناہموار زمین کو عبور کرتا ان چٹانوں پر پہنچ گیا اور ڈھلوان کی طرف دوڑنے لگا۔

"اوشا..." ایک بار اور اس نے ہانپتے ہوئے زور سے اسے پکارا۔ اس بار وہ ٹھٹکی، رکی اور پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ واقعی وہ اوشا کی روح تھی، لیکن جیسے اس نے روپ کی پرواہ بھی نہ کی۔ اس نے پھر منہ پھیر لیا اور ڈھلوان کی طرف چلتی رہی۔ روپ سمجھ گیا کہ وہ بری طرح روٹھی ہوئی ہے۔ وہ اب اسے آواز دیے بغیر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ مگر وہ کافی دور تھی

اور پھر آگے جب وہ ڈھلوان کا سلسلہ ختم ہو کر کوئی گہرائی آئی تو وہ اس میں اس طرح ڈوب گئی کہ جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ جانے کہاں چلی گئی وہ؟

روپ نے پھر بھی ہمت نہ ہاری تھی۔ اوشا کی روح کو دیکھ کر اس کے بیقرار دل کی دھڑکنوں میں طوفان آ گیا تھا۔ وفورِ جذبات سے وہ پاگل سا ہوا جا رہا تھا اور اسی طرح بے تحاشا دوڑتا رہا، مگر پھر اس کی رفتار میں سستی آنے لگی۔ موچ کھائے ہوئے پیر میں اچانک درد شروع ہو چکا تھا۔ وہ لنگڑانے لگا اور پھر بھی دوڑتا ہی رہا۔ آخر وہ بھی اس جگہ پہنچ گیا جہاں ڈھلوان ختم ہو کر گہرائی میں گزرنے والی کسی خشک پہاڑی ندی کے اس پار سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہیں کچھ نہ تھا۔ شاید وہ اس کی نظروں سے روپوش ہو چکی تھی، لیکن وہ اسی جگہ اس گہرائی میں ڈوبی تھی۔ وہ ابھی اس جگہ سے اس ندی کے گہرائی میں اتر گیا۔ سامنے دوسری طرف جہاں پہاڑی سلسلہ شروع ہوا تھا پتھروں کے درمیان ایک تاریک دراڑ تھی جیسے کوئی باریک سا درّہ اندر کی طرف چلا گیا ہو۔

''شاید یہ اس کا مسکن ہو۔ روحیں ایسے ہی بھیانک مقامات پر تو رہتی ہیں۔'' یہ سوچ کر اس درے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے اس پر ایک طرح کا خوف سا طاری ہو گیا۔ ''مگر وہ اسی لیے تو مارا مارا پھر رہا ہے۔ پھر ڈر کیسا؟ وہی تو اس کی زندگی کا مقصد اور محبت کا حاصل ہے۔'' یہ سوچ کر وہ اس میں داخل ہو گیا۔ اندر تاریکی آگے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ اپنے ہوش گنوائے، اس کی جستجو میں آگے بڑھتا ہی گیا۔ کافی آگے جا کر اوپر سے روشنی نے جھانکا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، زرد زرد آسمان درّے کے اوپر سے اسے جھانک رہا تھا۔ اور پھر اور آگے جا کر وہ درے پھیلتے پھیلتے پہاڑ کی اونچائی پر ایک پتھریلی پگڈنڈی سے جا ملا۔ وہ اس پہاڑ پر آ نکلا، جہاں بہت سے درخت گرے پڑے تھے، بہت سے اب بھی کھڑے تھے۔

مغرب کی طرف پہاڑ کا پھیلاؤ اونچا ہوتا ہوا آسمان سے ٹکرا رہا تھا۔ مشرقی سمت میں کچھ آگے ڈھلوان کے بعد دوسرا پہاڑی سلسلہ اس سے متعلق ہو گیا تھا۔ درخت زیادہ گھنے نہ

تھے۔اس پہاڑ کے پتھر زیادہ تر سرخ تھے۔وہ چاروں طرف نظر دوڑا کر کسی وجود کے کوئی آثار نہ پاتے ہوئے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسی پگڈنڈی پر آگے چلنے لگا۔آگے اوپر جا کر یہ پگڈنڈی پہاڑی کی دوسری سمت گھوم گئی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پہاڑ پر انسانوں کا گزر نہ ہوتا ہو۔کہیں کوئی آثار ایسے نہ تھے، سوائے ہواؤں کی سنسناہٹ میں ملی جلی درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر ایک لامتناہی سناٹے کے۔اور یہاں سے کھڑے ہو کر نیچے نگاہ ڈالنے سے دامن میں پھیلا ہوا موت کا شہر اینٹ پتھر اور مٹی کے تودوں کا ایک وسیع میدان معلوم ہوتا تھا۔

دھوپ تیز تھی اور کافی دور پیدل چلنے اور دوڑنے کے بعد اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی، مگر یہاں تو پانی کی دستیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ جب آدمی کے وجود کے ہی آثار نہ ہوں۔پہاڑی کی دوسری سمت پہنچ کر وہ ناہموار پتھریلی چٹانوں پر سے پھر ڈھلوان کی طرف گھوما۔پیاس اب اتنی شدت اختیار کر گئی کہ اس سے چلا نہ جا رہا تھا۔اس لیے وہ ایک درخت کے سائے میں ایک پتھر پر کچھ دیر ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر اوپر کی طرف اٹھ گئی۔جہاں پہاڑ میں کچھ اونچائی پر ایک کٹاؤ تھا جیسے کوئی گفا ہو جسے باہر کی طرف سے جنگلی جھاڑیوں اور ساگون کے بڑے پتوں کی ٹٹی باندھ کر گھیر دیا گیا ہو۔

اس گفا میں ضرور کوئی رہتا ہوگا۔کوئی تارک الدنیا، کوئی سادھو، کم از کم پانی تو مل ہی جائے گا پینے کو۔یہ سوچ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور تھکے ہوئے قدموں سے اوپر چڑھتا ہوا گفا کے ٹٹی والے دروازے پر پہنچ گیا۔اندر بھی سناٹا معلوم ہوتا تھا۔اس نے دو تین بار اس بانس کی کھپچیوں سے بنے ہوئے دروازے پر دستک دی اور پھر جواب کا انتظار کرنے لگا۔کچھ دیر بعد اندر سے ایک باریک سی آواز سنائی دی۔"آ جاؤ۔کون ہو؟"

وہ دروازہ اندر کی طرف دھکیل کر داخل ہو گیا۔یہ ایک چھوٹا سا صاف، مگر ناہموار صحن جیسا ٹکڑا تھا، جو اس پہاڑی گفا کے سامنے پھیلا ہوا تھا جو کسی دیو کے کھلے ہوئے منہ کی طرح

Akram Allahabadi

درمیان میں اونچی اور دونوں سروں پر ہونٹوں کے سروں کی طرح تنگ تھی۔ گفا میں اندر پتھریلے قدرتی فرش پر ایک سفید سی چادر یا ساڑی پہنے کوئی بوڑھی عورت بیٹھی غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جھجکنے لگا۔ دل میں اسے اس بھیانک اور سنسان ماحول میں ایک بوڑھی عورت کے موجودگی پر حیرت سی ہو رہی تھی۔

"یہاں آجاؤ، کیا بات ہے؟" اس بوڑھی عورت نے بڑی نرمی سے اسے بلایا۔

"مجھے بہت پیاس لگی ہے، تھوڑا سا پانی مل سکے گا یہاں؟" اس نے خشک گلے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اندر آجاؤ، یہاں ٹھنڈک ہے۔ ایک منٹ دم لے کر پانی پی لینا۔ دھوپ میں آئے ہوئے اچانک پانی نہیں پیتے۔" بوڑھی عورت نے مادرانہ شفقت کے ساتھ اسے سمجھایا اور وہ گفا کے پتھریلے فرش پر چڑھ کر اس بڑھیا سے کچھ فاصلے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ بوڑھی عورت غور سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا تمہارا بھی گھر برباد ہوا ہے یہاں؟ بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔" بوڑھی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"گھر؟ ہونہہ۔ میری تو زندگی ہی برباد ہوگئی ہے۔" وہ اس ہمدردی سے متاثر ہوکر بولا۔

"ایسی کیا بات ہے، بیٹا؟" بوڑھی نے نرمی سے دہرایا۔

"وہ...وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ میری کہانی صرف میری ہے۔ دنیا اسے نہیں سمجھ سکتی۔" اس نے سر کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔

بوڑھی عورت اسے پھر غور سے دیکھنے لگی۔ مگر روپ پتھریلے فرش پر نگاہیں گاڑے سوچ رہا تھا۔ یہ ایک اکیلی بوڑھی عورت اس ویران مقام پر جہاں جانور کا بچہ بھی نہیں ملا کیسا اور کیوں رہتی ہے۔ دماغ کہنے لگا ضرور یہ کوئی تارک الدنیا ہے۔ دنیا اور اس کی ہوا و ہوس کو ترک

Akram Allahabadi

کر دینے والے ہر شے سے بے نیاز ہر خوف سے نڈر ہو جاتے ہیں۔لیکن یہ پہاڑ اور اس کے دامن میں پھیلا ہوا وہ آوارہ روحوں کا شہر۔کہیں یہ کوئی جادوگرنی تو نہیں۔وہ سوچتے سوچتے ایک دم چونک کر بوڑھی عورت کی صورت دیکھنے لگا،مگر پھر خود اس کے دل نے ہی اس خیال کی تردید کر دی۔اتنی معصوم سی سادہ صورت۔وہ کوئی جادوگرنی نہیں ہو سکتی۔جادوگر یا تو ہوتے ہی نہیں اور ہوتے ہیں تو نہایت گندے اور کریہہ المنظر ہوتے ہیں۔تو پھر ضرور یہ کوئی ماہر روحانیات ہوگی۔ماہر روحانیات،دنیا سے دور،روحوں کی دنیا سے قریب اور اوشا کی روح بھی تو اسی پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر غائب ہوئی تھی۔اس خیال سے جیسے اس نے اس بوڑھی عورت کی اصلیت کو پہچان لیا ہو۔وہ دوبارہ اس کی طرف دیکھ کر پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔یہاں اور کوئی نہ تھا۔کسی کا وجود نہیں۔

"تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔ٹھہرو، پہلے پانی پی لو، پھر مجھے اپنی کہانی سنانا، شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور گفا میں اندر کی طرف تاریک گوشے میں چلی گئی جہاں اندر ایک اور اندھیرا کنواں معلوم ہوتا تھا۔روپ کو یقین سا ہو گیا کہ وہ ضرور ماہر روحانیات ہے۔

ممکن ہے وہ اس کی مدد کر سکے۔ممکن ہے وہ اسے اوشا کی روح سے ملا سکے یا اس کا پتا بتا سکے۔اس امید سے اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ذرا دیر میں بوڑھی عورت ایک مٹی کے گلاس نما برتن میں پانی لے آئی اور اس کی طرف بڑھا دیا۔یہاں گفا میں کافی ٹھنڈک تھی۔پانی بھی ٹھنڈا تھا۔روپ نے پانی پی کر جیب سے رومال نکال کر پسینہ اور منہ پوچھا اور پھر پیروں کے جوتے ڈھیلے کر کے بیٹھ گیا۔

"ہاں،اب تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اپنی کہانی۔دل کا درد بیان کر دینے سے غم کا بوجھ ہلکا ہو جایا کرتا ہے۔" وہ اس کے سامنے آکر ٹاٹ کے بچھے ہوئے ٹکڑے پر بیٹھ گئی۔

"شاید آپ سے بتا دینے میں کوئی ہرج نہ ہو۔ممکن ہے اس طرح میری کھوئی ہوئی

Akram Allahabadi

منزل کا کچھ پتا مل جائے۔"

یہ کہہ کر اس نے شروع سے اس عجیب داستان کو بیان کرنا شروع کر دیا، جو دنیا کی تمام داستانوں سے مختلف تھی، جو اس کی زندگی کا سب سے انوکھا اور سب سے بڑا المیہ تھا۔ اور جس کے گہرے نقوش اس کے دل کے ہر گوشے میں پیوست ہو چکے تھے، لیکن اس آپ بیتی کو بیان کرتے کرتے ایک جگہ وہ چونک کر رک گیا جب اچانک اس کی نظریں جو دوپہر کی دھوپ کی تیز روشنی سے اس ٹھنڈے ہلکے اندھیرے میں آ کر پہلے غور سے کچھ دیکھنے کے لائق نہیں تھیں اور اب ہر چیز پر قائم ہو چکی تھیں۔ اچانک گپھا کے ایک کونے میں لکڑی کے ایک ٹکڑے پر ٹنگے ہوئے اس سفید لباس پر پڑیں۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اوشا کی روح اس کھنڈر میں پہن کر آتی تھی۔ اس کے باریک کناروں پر بنے ہوئے سفید پھول اسے اب تک یاد تھے۔ بوڑھی عورت نے بھی اس کی یہ حرکت نظر انداز نہ کی۔ وہ ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

"اچھا پھر؟"

"جی... تو پھر..." وہ آگے سنانے لگا۔ مگر اب وہ جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کہتے کہتے کبھی کبھی وہ اٹک جاتا اور پھر پلٹ کر اس لباس کی طرف دیکھنے لگتا، مگر ایک بار تو وہ گنگ سا ہو گیا، جب اس لباس پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں گپھا کے ایک قدرتی کٹاؤ سے بنی ہوئی کارنس پر پڑ گئیں۔ اس کی وہ چھوٹی سی نوٹ بک، جو اوشا نے اس کھنڈر میں اٹھالی تھی اور جس میں روپ کا فوٹو بھی تھا۔ اس کارنس پر رکھی نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی وحشت اور بے ترتیبی سے وہ اپنی آپ بیتی کو ختم کرتے ہی اس بوڑھی عورت سے پوچھ بیٹھا۔

"کیا آپ کوئی آتما گنی (ماہر روحانیات) ہیں؟"

یہ سوال کرتے وقت اس کی نظریں پہلے کارنس پر رکھی ہوئی اس نوٹ بک پر اور پھر اوشا کی روح والے سفید لباس پر دوڑ گئیں۔ بوڑھی عورت شاید اس کا مطلب سمجھ کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا سکون، عجیب سی معنویت تھی۔

Akram Allahabadi

وہ کچھ دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" روپ نے بے چینی سے دوبارہ پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ بولی۔ "یہ نوٹ بک اور یہ لباس اوشا کی روح ہی میرے پاس چھوڑ گئی جب وہ واپس جا رہی تھی۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

روپ نے بیقراری سے دوڑ کر اس کے ہاتھ چوم لیے۔ بوڑھی عورت کے ماتھے کی جھڑیاں سکڑ گئیں۔ وہ بڑے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"تو ایشور کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ مجھے ایک بار اس سے ملا دیجیے۔ میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ صرف ایک بار اس سے ملا دیجیے کسی طرح سے۔" اس کی آواز میں امید اور آرزو کی لچک تھی۔ اس کی ویران آنکھوں میں آنسو لرزا اٹھے تھے۔ بوڑھی آتما گنی نے اس کو نظر بھر کر دیکھا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔

"مگر تم تو کہتے ہو کہ وہ تم سے بری طرح روٹھی ہے، پھر کیسے آئے گی۔ تم نے اچھا نہ کیا جو کلکتہ چلے گئے۔"

"میں زبردستی لے جایا گیا تھا۔ وہ مجھے ضرور معاف کر دے گی۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آ جائے گی۔" روپ نے جواب دیا۔

"بہت مشکل نظر آتا ہے۔" بوڑھی آتما گنی نے یہ کہہ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔

"بھگوان کے لیے اتنی کٹھور نہ بنیے۔ میں دوسرے جنم کا قائل نہیں۔ میں اس کا اور انتظار نہیں کر سکتا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا اس غم سے۔ مجھے صرف ایک بار اس سے ملا دیجیے۔" اور واقعی اس وقت اس کی جذباتی کیفیت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

دل کے ہاتھوں انسان کس طرح بے بس ہو جاتا ہے، وہ اس کی انتہائی معصومانہ مثال بنا ہوا تھا۔

"صرف ایک بار۔" بوڑھی نے دہرایا۔

Akram Allahabadi

"پھر میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرلوں گا۔" روپ نے جواب دیا۔
"بڑے جذباتی معلوم ہوتے ہو۔خیر، جاؤ کل وہ تمہیں اسی کھنڈر میں ملے گی۔"
بوڑھی آتما نے تحکمانہ لہجے میں آخر اس سے وعدہ کرلیا۔خوشی سے روپ کے آنسو پھوٹ پڑے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔
"اب جاؤ اور کل کا انتظار کرو۔تم بہت تھکے معلوم ہو رہے ہو۔"
بوڑھی عورت نے اسے رخصت کیا اور وہ خوشی خوشی گھپا سے نکل کر دوسرے راستے سے پہاڑ اترتا ہوا۔پھر تک اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹ آیا جہاں بوڑھا قبائلی اب تک اس کے لیے کھانا تیار کیے انتظار میں بیٹھا تھا۔بیچارہ وفادار غریب۔

☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن ٹھیک ساڑھے ۱۲ بج رہے تھے وہ جب کھنڈر میں داخل ہوا۔اس کی بیتاب نگاہیں تیر کی طرح آگے کی طرف تیرتی ہوئی اوشا کی روح پر جا کر رک گئیں۔خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔بوڑھی آتما گنی کا کل کا وعدہ بالکل سچ نکلا۔وہ اس وقت یہاں موجود تھی، لیکن آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔وہ بہت سنجیدہ معلوم ہو رہی تھی۔حالانکہ روپ خوشی کے آنسو آنکھوں میں لے کر مسکرایا۔وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔
"اوشا، تم آگئیں۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔
مگر اس نے جواب نہ دیا۔
صرف اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔روپ کی کیفیت بدلنے لگی۔
"تم مجھ سے ناراض ہو؟" اس نے دوبارہ کہا اور اوشا کی روح پھر کچھ نہ بولی۔
روپ کا اضطراب اور بڑھ گیا، لیکن آواز حلق میں گھٹنے لگی۔اس نے گھٹے گھٹے سے

Akram Allahabadi

دردناک لہجے میں کہا۔ ''میں بڑا بدنصیب ہوں، اوشا۔ زندگی میں میرے لیے کہیں بھی سکون نہیں۔'' کہتے کہتے اس کے آنسو ٹپکنے لگے۔ اوشا کی روح نے ان آنسوؤں کو دیکھ کر پہلو بدلا۔

''کیا تم معاف نہ کرسکو گی اپنے روپ کو؟ بھگوان ساکھشی (گواہ) ہیں کہ میں نے تمھیں کبھی اپنے دل سے نہیں بھلایا۔ میں بھلا بھی نہیں سکتا۔ تم میرے روم روم میں بسی ہو۔ مجھ پر ظلم کیا گیا تھا۔ مجھے مجبور کردیا گیا تھا۔'' وہ روندھے ہوئے گلے سے کہتا چلا گیا۔ اور اوشا کی روح ایک ٹک اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے اسے خموشی سے گھورتی رہی۔

''بولو، اوشا، ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت میں نے جیتے جی کسی سے نہیں کی۔ ایشور کے لیے اس طرح میری زندگی سے نہ کھیلو۔'' وہ چیخ اٹھا۔ اور وہ چپ نہ رہ سکی۔

''اوہ، میں تمھیں تمھاری شادی کی مبارکباد دینا تو بھول ہی گئی۔'' اس نے چونک کر کہا۔

''شادی...؟ یہ غلط ہے۔ تمھیں دیکھ کر میں نے سہرا نوچ کر پھینک دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی شادی کس سے ہوئی۔'' روپ نے تردید کی۔

''اور اگر میں نہ آتی؟'' اپنے مخصوص محبوبانہ انداز میں اوشا کی روح نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

''تو میں قربانی کا بکرا بنا کر بلیدان کردیا جاتا۔ تمھارے کول چرنوں کی قسم، اوشا، مجھے سوائے تمھارے کسی سے محبت نہیں۔ میری وہ زندگی میرے لیے دوزخ سے بدتر ہوتی۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہ رہ سکتا۔'' روپ نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں اس وقت جذباتی لچک صاف نمایاں تھی۔

''اور اتنے دن جو رہے؟'' اوشا کی روح نے سوال کیا۔

''صرف اس امید پر کہ کسی طرح موقع ملے اور میں تم تک پہنچ سکوں۔'' روپ نے

کہا۔

"شاید۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"مجھ پر یقین کرو، اوشا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایشور کے لیے اب تو مجھے معاف کردو۔" اس بار اس کی التجا میں بہت درد تھا۔ وہ آخر مسکرا پڑی۔

"تم بہت جلد مایوس ہوجاتے ہو۔ جذباتی لوگوں کی یہ فطرت ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"میں کیا کروں۔ میں دل کے ہاتھوں بالکل بے بس ہوجاتا ہوں اور تمہارے سامنے تو مجھے کوئی ہوش نہیں رہتا۔" روپ نے والہانہ انداز میں کہا۔

"خیر، اب مجھے کوئی شکایت نہیں۔" وہ پھر اپنی محبوبانہ مسکراہٹوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"اب تو تم سے دور نہیں رہا جاتا، اوشا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ہی کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں۔"

"مجھ تک؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔

"ہاں۔ اگر تم تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنی زندگی کو بھی ختم کرنا پڑا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ مگر اب تم سے دور نہیں رہا جاتا۔ میں انسان ہوں، اوشا۔ ایک زندہ انسان۔ اور جب تک میرا جسم میری آتما کے ساتھ رہے گا، جذباتی جنون کے ساتھ میری آرزوئیں بڑھ بڑھ کر مجھ پر جینا حرام کرتی رہیں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ مجھے اپنے پاس بلالو۔" وہ اس سے درخواست کرنے لگا۔ جیسے یہ بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہو۔

"صبر اور ہمت سے کام لو۔ ہر آغاز کا کچھ نہ کچھ انجام ضرور ہوتا ہے۔" اوشا کی روح نے اسے سمجھایا۔

"مگر آتما گئی نے تمہیں مجھ سے صرف ایک بار ملانے کا وعدہ کیا تھا۔ اتنی مدت بعد تم سے ملنے کی جو خوشی مجھے ہوسکتی تھی، اسے یہ ڈر چھینے لے رہا کہ پھر آج کے بعد کیا ہوگا۔" وہ

Akram Allahabadi

اداس ہوگیا۔

''زندگی اور موت کے لیے قدرت کا قانون الگ الگ ہے۔ لیکن ملاپ کے راستے وہی نکال سکتی ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا تم پھر نہ آؤ گی؟'' روپ نے امید و مایوسی کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے صرف آج کی اجازت دی گئی ہے۔'' اوشا کی روح نے جواب دیا۔

''ایسا نہ کہو۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر میں کس طرح جیوں گا؟ یہ ظلم ہے کہ نہ مرنے دیتی ہو نہ جینے دیتی ہو۔'' وہ پھر جذباتی بن گیا۔

''ممکن ہے وہی آتما گی تمہاری کچھ مدد کر سکے۔ میں حکم کے آگے بے بس ہوں۔ اور یہ تمہاری غلطی کا ہی نتیجہ ہے کہ میری آزادی چھین لی گئی ہے۔'' اوشا کی روح نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں اس اتفاق کے لیے بہت شرمندہ ہوں، اوشا۔ لیکن مجھے اس کی اتنی کڑی سزا نہ دو کہ برداشت نہ کر سکوں۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''میرے اختیار میں نہیں ہے۔'' اوشا کی روح نے کہا۔

''تو پھر ایک طرف میری محبت ہوگی اور دوسری طرف قدرت کی ضد۔ ہار جیت کا فیصلہ اب میری زندگی اور موت پر ہوگا۔'' روپ کے لہجے میں ایک مضبوط فیصلہ، ایک جوش پر آئی ہوئی محبت جھلکنے لگی۔

''محبت، ہونہہ۔ وہ اس وقت کہاں گئی تھی جب تم کلکتے جا کر بیٹھ رہے تھے۔'' اوشا کی روح نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ طنز کیا۔

''ان گہرے زخموں کو ایشور کے لیے نہ کریدو۔ تم پہلے ہی مجھے معاف کر چکی ہو۔'' روپ کے چہرے پر اضطراب نمایاں ہوگیا۔

''خیر، یہ امتحان ایک بار اور سہی۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

Akram Allahabadi

"اتنی جلدی؟" روپ بھی بیقرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، جانے کا وقت ہو چکا ہے۔" وہ بولی۔

"اور کل؟" روپ نے اپنی امید کی تجدید چاہی۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ اس طرح اب ہمارا ملنا ممکن نہیں۔" اوشا کی روح نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا۔

"اف، تم تو میری رہی سہی امید کا سہارا بھی چھین چلیں۔ میں اب کیسے جیوں گا۔" روپ کی آنکھوں میں درد سے آنسو آ گئے۔

"کیوں، کیا میری محبت پر پھر اعتبار نہیں رہا؟" روح نے پلٹتے ہوئے کہا۔

"ہے، لیکن اب تم تک پہنچنے کی آرزو میری ہر سانس سے وابستہ ہو چکی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا کروں۔ لیکن سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" روپ نے جواب دیا۔

"وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا۔"

"اور وہ وقت؟"

"کون جانے، کب آئے۔" یہ کہہ کر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر دالان سے گزر کر پچھلے بڑے شکستہ کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"اوشا..." وہ پھر پیچھے سے چیخا۔

"میرا پیچھا کرنے کی کوشش ہمیں ایک دوسرے سے اور دور کر دے گی۔" وہ وہیں سے پلٹ کر بولی۔ اور روپ لاجواب سا ہو کر گم سم کھڑا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اس وقت کیا کرے جب اس کی زندگی کا کھویا ہوا سکون اسے ایک بار پھر مل کر ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑا جا رہا ہے۔ اس کی دنیا سے روشنی کی آخری کرن اس کے سامنے رخصت ہو رہی ہے اور وہ اسے روک نہیں سکتا۔ وہ اسے پکڑ نہیں سکتا، کیونکہ وہ محض روشنی ہے۔ محض ایک عکس۔

تب تک وہ پچھلے شگاف کے نزدیک پہنچ کر غائب ہو چکی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اپنے بوجھل قدم ناہموار زمین کے سینے پر بے ترتیبی سے رکھتا نڈھال سا اپنی جائے قیام کو لوٹ آیا۔ آج اس کے مسکرا اٹھنے والے لبوں سے شگفتگی پھر چھن گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بیمار ہے۔ یہ اور برا ہوا کہ کھوئی ہوئی اوشا کی روح ملی اور مل کر پھر ہمیشہ کے لیے یا پھر انجانی مدت تک کے لیے اس سے بچھڑ گئی۔ اب وہ کیا کرے گا۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈ سکے گا۔ جسے ایک ایک پل دیکھنے کے لیے آنکھوں کی پیاس بڑھ گئی ہے۔ جس سے دور رہ کر دل بیٹھا جا رہا ہے۔ زندگی میں اچانک اتنے گہرے پھیل جانے والے اندھیروں میں ایک آخری امید کی روشنی وہ بوڑھی آتما گنی (ماہر روحانیات) تھی، مگر اس نے تو پہلے اس سے صرف ایک بار اوشا کو ملانے کا وعدہ کیا تھا، جو وہ پورا کر چکی تھی۔ وعدے دہرائے نہیں جاتے۔

وہ بھی خفا ہو گئی تو یہ آخری ذریعہ بھی ٹوٹ جائے گا اور پھر زندگی کے باقی دنوں تک وہ اضطراب کی شدید اذیتوں میں مبتلا رہ کر نہ جانے کس طرح گھڑیاں بیت سکیں گی۔ بیت بھی سکیں گی یا خودکشی کرنی پڑے گی۔

☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن پھر وہ ایک موہوم سی امید لے کر اس کھنڈر تک گیا۔ وہاں دوپہر کا سورج مغرب میں کافی ڈھل جانے تک وہ ایک ایک کھڑکھڑاہٹ، ایک ایک آہٹ پر اوشا کی روح کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ شام کو واپس لوٹتے اس کی طبیعت اور بھاری ہو گئی۔ اس نے صبح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بوڑھا قبائلی اس کی اس عجیب شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ آج مایوسی کی تجدید ہونے سے روپ اور نڈھال ہو گیا۔ اس کا دل بری طرح پچھلے لمحات یاد کر کے تڑپتا رہا۔ بار بار یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا کہ اب وہ کبھی نہ مل سکے گی۔

بڑی الجھن اور تکلیف سے اس نے کروٹیں بدل کر یہ رات گزاری۔

صبح بوڑھے کی بڑی خوشامد پر چائے کے ساتھ ذرا سا ناشتہ کرلیا اور دن ابھی چڑھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر اپنے جھونپڑے سے نکل گیا اور کیمپ کے ویران میدان کو عبور کر کے خشک نالے کو پار کرتے ہوئے موت کے شہر کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس کھنڈر کے نزدیک پہنچا تو ساڑھے ۱۱ بجے تھے۔ اوشا کی روح کی واپسی کی ایک موہوم سی امید دل میں لیے وہ اسی جگہ ۲ بجے دوپہر تک بیٹھا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ وہ مایوس ہو گیا کہ اب وہ نہ آئے گی اور اس احساس کے ساتھ وہ ہلکی سی آس بھی دردناک اداسی میں ڈوب گئی جو کسی واقع ہو جانے والے معجزے کے تخیل کی طرح اس کے دل میں ابھی تک پوشیدہ تھی۔

اوشا کی روح کا اس طرح ایک بار اور مل کر بچھڑ جانا اس کے لیے پچھلی تمام روحانی اذیتوں سے زیادہ غمناک تھا۔ عشق اپنے پورے اشتعال پر پہنچ چکا تھا اور جنون نے خرد کے تمام تقاضے رد کر دیے تھے۔ وہ کھنڈر سے لوٹ آیا۔ آتما گنی کے پاس جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ وہ اس سے کیا کہے گا۔ ایک ہی وعدہ تو طلب کیا تھا اور وہ پورا ہو چکا تھا۔ لوگ کیا جانیں کہ محبت پایہ تکمیل کو پہنچ جانے والی ہر آرزو سے صرف مطمئن نہیں ہوتی، بلکہ آگے بڑھ کر جایا کرتی ہے اور پھر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

آج باقی دن اور پوری اندھیری رات اس نے شدت کرب سے کروٹیں بدل بدل کر یہ سوچتے گزار دی کہ آگے کیا ہوگا۔ منجدھار میں پھنسی ہوئی یہ ناؤ کس کنارے لگے گی۔ مگر دوسرے دن صبح جب وہ اٹھا تو کسی قدر مطمئن تھا۔ آج وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ محبت اپنی تکمیل کے لیے پہنچ کر زندگی میں لٹا دینے کو تیار ہو چکی تھی۔

محبت قربانی چاہتی ہے، دینی ہی پڑے گی۔ اس کے بغیر زندگی ہی کیسی جو دل کی دھڑکنیں چرا لے گیا ہو۔

دوپہر ہوتے ہوتے وہ آج پھر ہمت کرکے اس پہاڑ پر پہنچ گیا۔ اوشا کی روح کے

لوٹ آنے کی امید کے دم توڑنے کے ساتھ یہ آخری سہارا وہ آتما گنی ہی تو رہ گئی تھی جو اگر اسے اب اوشا کی روح سے ملا نہ سکے تو کم از کم اس تک جا پہنچنے کا راستہ تو بتا سکتی ہے۔ وہ ضرور کچھ کرے گی۔ وہ رحمدل عورت ہے۔ اور جب اس کے گفا پر پہنچ کر ٹٹی کے دروازے پر دستک دی تو تھوڑے وقفے کے بعد اندر سے وہی بوڑھی باریک آواز سنائی دی۔

"آ جاؤ، کون ہو تم؟"

وہ اندر چلا گیا۔ ایک موٹے سے کپڑے کی سفید ساڑی میں ملبوس وہ بوڑھی آتما گنی گفا کے باہری سرے پر ہی بیٹھی اس کی طرف تک رہی تھی۔ روپ کو دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم پھر آ گئے؟" روپ کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس کا پہلا ہی سوال اتنا روکھا تھا۔

"جی۔" وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے ہوئے اس کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے مشفقانہ آواز میں کہا۔ اور روپ اپنی جگہ پتھر یلے فرش پر بیٹھ گیا۔

"وہ تمہیں ملی تھی؟" بوڑھیا نے کہا۔

"جی، ملی تھی۔ اس نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ مگر صرف ایک بار کے ملاپ نے میری زندگی کی گھڑیاں مجھ پر اور تنگ کر دی ہیں۔" روپ کی آواز بھرا گئی۔

"کیوں؟ کیا یہ تمہاری آرزو نہ تھی؟" بوڑھی آتما گنی نے پوچھا۔

"میں سمجھا تھا کہ میری محبت اسے دوبارہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"مگر نہ ہو سکی۔ کیا اس محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟" آتما گنی کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے نہیں معلوم، مگر اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اس سے جس قدر محبت ہے، شاید چکور کو چاند سے اور پروانے کو شمع سے نہ ہو گی اور پھر بھی اگر میری محبت نامکمل ہو سکتی ہے تو میں بدقسمت

ہوں۔اس کی تکمیل کے لیے اگر میری زندگی بھی مجھ سے مانگی جائے تو میں یہ خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔" روپ جذبات سے بری طرح متاثر اور روالہانی انداز میں بولا۔

"مگر کسی روح سے محبت کا انجام تمہیں سوچنا چاہیے۔" بوڑھی آتما گنی کی سنجیدگی پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ میں بدلی۔

"جب محبت اپنا آغاز نہیں سوچ سکتی تو انجام کیا سوچے گی۔اور شاید ایسا انجام میرے لیے خوشگوار ہی ہوگا۔ممکن ہے اس طرح میں ہمیشہ کے لیے اس کے قریب ہو جاؤں۔"

"مگر تمہارے درمیان جو دیوار حائل ہے؟" آتما گنی نے کسی خاص رکاوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا یہ خالی وجود؟ میں اسے اوشا کے لیے کسی وقت بھی قربان کرسکتا ہوں۔اگر اس تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے تو میں آج، ابھی، اسی وقت قربان کرنے کو تیار ہوں۔شاید روحوں کی دنیا میں وہ مجھ سے کبھی دور نہ ہو سکے۔" روپ کھوئے ہوئے انداز میں باہر پھیلے ہوئے ہلکے نیلگوں آسمان کی خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔جیسے اوشا کی روح، دور، حدِ نظر سے بہت دور، ان خلاؤں کے اس پار، روحوں کی دنیا کے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہو۔

"کہنے اور کرنے میں فرق بھی تو ہو سکتا ہے۔" آتما گنی معنی خیز الفاظ میں بولی۔

"میں کسی امتحان سے گزرنا نہیں چاہتا۔میں تو آپ سے صرف یہ درخواست کرنے آیا ہوں کہ اگر میری جان لے کر بھی آپ مجھے اس تک ہمیشہ کے لیے پہنچا سکتی ہیں تو ایشور کے لیے دیر نہ کیجیے۔اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔اسے کوئی دیوانگی کہیے یا بے صبری، لیکن کبھی کسی سے محبت نہ کرتے ہوئے میں نے پہلی بار محبت کی ناقابلِ تردید قوت کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔میں بالکل بے بس ہو چکا ہوں۔اگر اوشا مجھے نہ مل سکی تو میں غم سے پاگل ہو جاؤں گا۔میرا سب کچھ وہی ہے۔وہ نہ ہو تو میں یہ درد میں ڈوبی ہوئی زندگی بھی نہیں چاہتا۔یہ میرے کسی کام کی نہیں۔مجھے اس دنیا کی رنگینیوں سے کوئی دلچسپی نہیں، جو میرے لیے کسی کی محبت کے بغیر بے

Akram Allahabadi

جان ہیں۔"

"مگر محبت کرنے کے لیے تمہیں زندہ لڑکیاں بھی تو مل سکتی ہیں۔شاید اوشا سے بھی خوبصورت۔"

"محبت اگر کی جانی والی چیز ہوتی تو میں اس طرح پاگل نہ ہوتا۔عالمِ بالا کی ایک پاکیزہ محبت کو کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔وہ کبھی بدل نہیں سکتی۔وہ تیز اور مدھم کڑوی اور میٹھی نہیں ہوتی۔وہ ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔میں اس کی محبت چاہتا ہوں جو لامحدود زمانے تک مجھ سے محبت کرتی رہے، جو صرف میری ہو۔اور جو جذباتی لغزشوں سے بے نیاز اور آسمان کی بلندیوں کی طرح پاکیزہ ہو۔" روپ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم فلسفیانہ حد تک محبت سے متاثر ہو چکے ہو۔" بوڑھی پھر مسکرا پڑی۔

اور روپ کچھ حیران سا رہ گیا کہ اس کی مسکراہٹ کا انداز بھی اوشا کی روح جیسا ہی تھا۔بالکل اسی طرح اس کے ہونٹ بھی پھیلتے پھیلتے بھینچ جایا کرتے تھے۔وہ سوچ میں پڑ گیا۔

یہ بوڑھی ماہرِ روحانیات...؟؟؟

"تو تم ہمیشہ کے لیے اس تک پہنچنے کے لیے تیار ہو؟" بوڑھی نے دہرایا۔

"جی...؟" وہ چونک پڑا۔"میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کونسی تمنا ہو سکتی ہے۔"

"مگر وہاں تمنائیں تو نہ ہوتی ہوں گی۔" بوڑھی نے کہا۔

"وہ جب میرے نزدیک ہوگی تو پھر کوئی تمنا نہ رہے گی۔" روپ بولا۔

"خیر، تمہارے پاگل پن کا اب کوئی علاج نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

روپ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اپنی باتوں کا جواب چاہتا ہو۔

"میں آتی ہوں۔" وہ بولی۔اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گپھا کے اندھیرے گوشے کی طرف تاریکی میں چلی گئی۔روپ بے قراری سے اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔

اوشا اس کے تصور میں موجود تھی۔

Akram Allahabadi

تھوڑی دیر بعد ہی بوڑھی عورت لوٹ آئی۔اس نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کیا اچھا نہ ہوگا جو تم ایک بار پھر سوچ لو۔تمہاری جدائی تم سے وابستہ لوگوں پر کتنا غم توڑے گا، جانتے ہو؟''

''جس کا اپنا کلیجہ غم سے پھنکا جا رہا ہو، وہ دوسرے کا غم کیا سوچے۔دنیا میں سب اپنی اپنی زندگی جیتے اور مرتے ہیں۔کوئی کسی کے لیے چند دنوں سے زیادہ افسوس نہیں کرتا۔'' روپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تو روحوں کی دنیا تک پہنچنے کے لیے تمہیں یہ دنیا چھوڑنی ہی ہوگی۔''

''میں تیار ہوں۔'' روپ کا دل دھڑکنے لگا۔جیسے بس اب کچھ دیر میں وہ ہمیشہ کے لیے اوشا کے نزدیک پہنچ جائے گا۔

''پیچھے سے پہاڑ کافی اونچا اور کٹاؤ دار ہے، چاہو تو اس پر سے کود کر تم اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتے ہو۔'' بوڑھی عورت نے اسے پراسرار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ ملے گی وہاں؟'' روپ اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' بوڑھی آتما گنی نے کہا۔

''انتظار...؟ میرا...؟ تو میں جاتا ہوں۔میں ابھی جاتا ہوں۔اب نہیں ٹھہر سکتا۔کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس کے لیے اپنی زندگی کو قربان کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔'' وہ آگے چلنے لگا۔

''جاؤ، تمہاری محبت تمہاری رہنمائی کرے۔'' بوڑھی آتما گنی نے پیچھے سے مسکرا کر کہا۔اور روپ آخری آخری نظر اس کی طرف ڈالتا ہوا تڑپتے دل میں ایک عجیب سی آرزو کو دبائے، دماغ میں بس ایک تخیل ایک مقصد لیے وہاں سے نکل کر ناہموار چڑھاؤ کو طے کرتا ہوا پہاڑی کی پچھلی سمت بھاگا۔ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے محبت کی دیوانگی نے اس کی عقل و خرد کو بالکل مفلوج کر دیا ہے۔وہ بجز اوشا کے کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں رہا۔دوڑتا دوڑتا، وہ پہاڑ

کے اونچے سرے پر پہنچ گیا، جہاں سے گہرا کٹا ؤ ایک دم دیوار کی شکل میں نیچے دور تک چلا گیا تھا یہاں سے صرف ایک جست کسی کو بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم کرسکتی تھی۔ وہ اس کی فلک بوس اونچائی پر ٹھہر کر آسمان کے انجانے خلاء میں گھورنے لگا۔ وہ اس پار اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اور جیسے سوچ سے بہت دور اڑتے ہوئے بادل کے ایک سفید ٹکڑے میں اسے اوشا کا لہراتا ہوا سفید آنچل نظر آگیا ہو۔

"اوشا... میں آرہا ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آرہا ہوں۔" آسمان کی طرف منہ کر کے بڑبڑاتے ہوئے اس نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ بغیر کسی روک کے نیچے پہاڑ کی گہرائیوں میں جا گرے، مگر اچانک کسی نے اسے روک لیا۔ کسی نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ وہ چونک کر ایک دم پلٹا۔

"اوشا..." وہ حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ چیخا۔ اور پھر اس وارفتگی میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ وہ محض ایک اروح ہے، ایک ہوا ہے۔ وہ بیقراری کی معراج پر جذبات کے ناقابلِ عبور طوفان سے متاثر ہو کر ایک دم اس سے لپٹ گیا۔ اس نے کچکچا کر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ایسے جیسے وہ اسے اپنے سینے میں ہی پیوست کر لینا چاہتا ہو۔ آنکھوں کے دونوں سروں سے خوشی کے آنسو پھوٹ نکلے تھے اور اسے کچھ سدھ بدھ نہ تھی۔ اوشا کی روح اس کی آغوش میں تھی۔ کئی منٹ تک ان میں سے کسی کو کچھ ہوش نہ رہا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی کیفیت اعتدال پہ آتی گئی اور اس پر ایک عجیب سا خوف طاری ہوتا گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ ایک روح سے بغلگیر ہے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور اوشا بھی اس کی گرفت سے پرے ہٹ گئی۔ ایک منٹ تک وہ ایک دوسرے کو گم سم دیکھتے رہے۔ مگر نہ جانے روپ کو پھر کیا خیال آگیا۔ وہ چونک کر بولا۔

"تمہارا وجود ٹھوس ہے، اوشا۔ تم ہوا نہیں ہو۔" اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ابتک وہ اسے محض ہوا، محض ایک عکس سمجھتا رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے اسے چھوتے ہوئے

Akram Allahabadi

ڈرتا تھا۔اوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔

روپ کی عارضی خوشی پھر اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ کہنے لگا۔ ’’تم نے مجھے کیوں روک لیا۔ میں تو ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آرہا تھا۔‘‘

’’ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔‘‘ اوشا کی روح نے کہا۔

’’میں اور زیادہ انتظار نہیں کرسکتا، اوشا۔ میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں آج نہیں مانوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ پھر پہاڑ کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

’’ایسے پاگل نہ بنو، میں کہتی ہوں۔‘‘ اوشا کی روح نے پھر اسے روک۔

’’کیا تم پسند نہیں کرتیں کہ میں تمہارے قریب آسکوں۔‘‘ وہ ٹھٹک کر اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’آخر تم چاہتے کیا ہو؟‘‘ اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

’’صرف تمہیں۔تم میری نظروں سے اوجھل رہو، یہ اب میں برداشت نہیں کرسکتا۔‘‘ اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

’’تو پھر میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں اسی کھنڈر میں ملا کروں گی۔ اب تم لوٹ چلو۔‘‘ اوشا نے سنجیدگی سے کہا۔

’’کیا یہ تمہارا وعدہ ہے؟‘‘ روپ نے پر امید لہجے میں اس کی طرف لوٹتے ہوئے سوال کیا۔

’’ہاں۔‘‘ اوشا کی روح نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

’’تو کیا تمہیں اس کی اجازت دے دی گئی۔‘‘ روپ اس کی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھا۔

’’ہوں۔‘‘ اوشا کی روح نے اقرار کیا۔

’’آتما گنی نے تو کہا تھا...‘‘ روپ کہنا چاہتا تھا کہ اوشا کی روح پھر بیچ میں بول

پڑی۔

"وہ تمہاری محبت کی آزمائش تھی۔"

"تو اب؟"

"ہم پھر مل سکتے ہیں۔ لیکن اب کی بار پھر اگر کسی اور نے ہمیں دیکھ لیا تو دوبارہ ہمارا ملاپ ممکن نہیں۔ تمہیں یہ یاد رکھنا ہوگا۔" اوشا کی روح نے تاکید کی۔

روپ نے دوڑ کر پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں اب اپنی زندگی کو کبھی بچھڑنے نہ دوں گا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔" روپ کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

"یہ محسوس کر کے کہ تم صرف ہوا نہیں، بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہو، مجھ میں ایک نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی اور جیوں، سو سال جیوں، جب تک تم میرے قریب رہو، تب تک جیتا رہوں۔" وہ انتہائی جذباتی ہو کر بولا۔ آہستہ سے روپ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا، اب میں جاتی ہوں۔ کل کھنڈر میں تمہارا انتظار کروں گا۔" روپ اسے محبت بھری نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"لیکن تمہیں اپنا وعدہ یاد رکھنا ہوگا۔ ایک بھول بار بار معاف نہیں ہو سکتی۔" چلتے چلتے اس نے ایک بار اور تاکید کی۔

"اسے کیسے بھول سکتا ہوں جس کا تعلق میری موت و زندگی سے ہو۔" روپ نے کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" اس نے روپ کو رخصت کرنا چاہا۔ "میں ابھی آتما گنی سے ملوں گی۔" یہ کہہ کر وہ خرامِ ناز سے چلتی ہوئی اونچی اونچی چٹانوں سے اتر کر بوڑھی آتما گنی کی گپھا کی طرف گھومتی ہوئی غائب ہو گئی۔

Akram Allahabadi

اور روپ آج کے مسرت آگیں احساس کو دل میں لیے جھومتا گنگناتا لوٹ آیا۔ آج اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ زندگی جس میں رومان کی رنگینیاں ایک دلفریب ملاپ کی شکل میں سمٹ آئی تھیں۔ کتنا خوش تھا آج وہ جیسے سکندر نے دنیا کو فتح کر لیا ہو۔

وہ رات اس نے عجیب عجیب خوبصورت مختلف اور مسلسل خواب دیکھتے گزاری۔ آج کا دن شاید اس کی زندگی کا سب سے قیمتی دن تھا۔ بڑا سہانا، بڑا انوکھا۔ بوڑھے قبائلی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ روز اداس رہنے والا بابو آج آپ ہی آپ ہنسا کیوں پڑ رہا ہے۔ وہ اپنی بوڑھی عقل سے بار بار سوچ میں پڑ جاتا۔

"کہیں کوئی خزانہ تو نہیں مل گیا۔" مگر اس کی پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھ سکے۔ صبح بھی وہ جب سو کر اٹھا تو آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ایک عجیب سا خمار لیے، جیسے کھوئی ہوئی منزل کو دوبارہ پا جانے والے کسی کامیاب مسافر کی آنکھوں میں خوشی کے تاثر سے چھلکنے لگتا ہے۔

اوشا کی روح کی آمد کا وقت دوپہر تھا، لیکن احساس محبت میں شدت کے ساتھ جو از خود رفتگی پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی وہ ہر وقت اسے اوشا کے لیے بیقرار رکھنے لگی تھی۔ آج اسے بھوک بھی خوب لگ آئی تھی ورنہ وہ روز بس یونہی بوڑھے کے مجبور کرنے سے کچھ کھا لیا کرتا تھا۔ کھانا آتے آتے دیر ہوگئی اور دس یوں ہی بج گیا تو وہ کچھ جھنجلا سا اٹھا۔ مگر ایسی جلدی بھی کیا۔ آخر وہ ابھی سے تو نہ آ گئی ہوگی۔

تقریباً ساڑھے ۱۰ بجے وہ اس قبائلی بستی سے کیمپ کے ویران میدان کی طرف سے ہوتا ہوا موت کے شہر کی طرف روانہ ہوگیا اور ایک گھنٹے کے اندر وہ اس کی حدود میں داخل ہوگیا۔

کھنڈروں کی بڑھتی ہوئی ویرانی ان کے بھیانک پن کو اور بڑھاتی جا رہی تھی مگر اب اسے اس روحوں کے شہر سے ڈر نہ لگتا تھا۔ وہ جب ادھر ادھر لاپرواہی سے نگاہیں دوڑاتا، اس

ٹیلے پر چڑھا تو اوپر سے زمین پر گرے ہوئے خشک پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز اسے سنائی دی۔

شاید کوئی چوہا ہوگا۔وہ اپنی دھن میں یہی سوچتا ہوا اوپر چڑھ کر اس زمین میں دھنسی ہوئی چٹان کے نزدیک پہنچ گیا، لیکن یہاں پہنچ کر اچانک اس کی مسرور کیفیت ایک عجیب سے تذبذب میں بدل گئی۔وہ حیران بھی تھا اور غصے میں بھی۔

کھنڈر کے شکستہ ورانڈے کے سرے پر باہر کی طرف جہاں سے کھنڈر میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ایک نیم شکستہ لکڑی کے کھمبے سے ٹکا ہوا کوئی بوڑھا آدمی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے سادہ اور شریفوں جیسے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یا تو کچھ سوچ رہا ہے یا جیسے تھک کر کر بیٹھ گیا ہے۔

روپ عجیب سی الجھن میں پڑ گیا۔اگر چہ ابھی اوشا کی روح کے آنے میں کچھ دیر تھی، لیکن وہ آ گئی اور یہ بوڑھا یہاں موجود رہا تو غضب ہو جائے گا۔بوڑھے نے اسے دیکھ لیا تو پھر وہ کبھی نہ آ سکے گی۔اس نے کل ہی آخری بار وعدہ لیا تھا روپ سے۔

''اف، یہ کیا مصیبت ...'' وہ پشت پر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر وہیں ورانڈے کے سامنے ٹہلنے لگا۔اس کے بھاری قدموں کی چاپ سن کر بوڑھے آدمی نے اپنا چہرہ اوپر کو اٹھایا اور قبل اس کے کہ روپ اس سے کچھ کہے اس کی پریشان اور بوڑھی آنکھوں سے رِس رِس کر جھریوں وار زرد گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں نے روپ کی زبان تھام لی۔وہ صرف ایک دوسرے کو خاموش اور اجنبی نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

بوڑھے نے پھر سر جھکا لیا اور روپ کی پریشانی اور بڑھنے لگی۔

''اے ایشور، کیا ہونے والا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔اس کی مٹھیاں بار بار بھینچ رہی تھیں، کھل رہی تھیں اور دماغ سوچ رہا تھا۔

''نہ جانے کون ہے یہ بوڑھا آدمی؟''

Akram Allahabadi

"یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"اور آیا تھا تو یہی کھنڈر کیا اسے بیٹھ کر رونے کو ملا ہے؟"

"بیٹھا ہے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا؟"

"شاید اس کے بیوی بچے یا عزیز اس موت کے شہر میں تباہ ہو گئے ہوں گے۔"

"غریب ہے بیچارہ۔"

"لیکن یہیں کیوں؟"

"اور وہ آ گئی تو؟"

اور اندر سے روپ کا دل بول اٹھا۔ "اٹھ جاؤ بڑے میاں یہاں سے۔"

"ایشور کے لیے اٹھ جاؤ۔ وقت قریب آ رہا ہے۔"

لیکن جب وہ دو تین منٹ تک اور یونہی بیٹھا رہا تو روپ سے نہ رہا گیا۔ وہ اس کے نزدیک پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

"آخر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" اس نے عجیب سا سوال کیا۔

"کیوں؟" بوڑھے نے پھر اپنی بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ "کیا یہاں بیٹھنا بھی گناہ ہے؟"

"اف، تم نہیں جانتے، مگر تم یہیں کیوں آ بیٹھے؟" روپ ٹہلتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"تمھیں کہیں اور جگہ نہ مل سکی تھی؟"

بوڑھے نے گہری اداس نظر سے اسے دیکھا اور روکھی سی آواز میں بولا۔

"اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" روپ لاجواب ہو کر بولا اور ٹہلنے لگا۔

"لیکن ایشور کے لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔" اس نے پھر اس کے سامنے رک کر کہا۔

''آخر تم ہی کیوں نہیں چلے جاتے یہاں سے؟ مجھے بیٹھ کر رونے دو اپنی تقدیر کو۔''
بوڑھا جھنجلا کر بولا۔

''کیا تمہارے رونے کے لیے ڈیرہ وگڑھ میں اور کوئی جگہ نہیں؟'' روپ یہ کہہ کر پھر پریشان سا ٹہلنے لگا۔ اس کا دل اندر سے گھبراتا جا رہا تھا۔ اوشا کی روح کی آمد کا وقت قریب ہوتا جا رہا تھا اور بوڑھا وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ روپ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی، ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ نہ جانے آگے کیا ہونے والا تھا، کہیں وعدے کے پہلے ہی دن وہ پھر ہمیشہ کے لیے نہ چھوٹ جائے۔ وہ بری طرح ڈر رہا تھا۔ کوئی اور طریقہ نہ پا کر اس کے پاس آ کر بولا۔

''چلے جاؤ بڑے میاں یہاں سے۔ وہ آتی ہوگی۔''

''کون؟'' بوڑھے نے سر اٹھا کر سوال کیا۔

''تمہاری موت۔ وہ ایک روح ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو مر جاؤ گے۔ بھگوان کے لیے اس سے پہلے کہ وہ آئے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

جواب میں بوڑھے نے اسے ایسی غیر معتبر نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پرلے سرے کا خبطی سمجھ رہا ہو۔ روپ سمجھ گیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے پھر دہرایا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، بڑے میاں۔ وہ روحوں کی دنیا سے یہاں گھومنے آتی ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے۔ تم چلے جاؤ، ورنہ مر جاؤ گے اسے دیکھ کر۔'' روپ نے بوڑھے اجنبی کو ڈرانا چاہا۔

''اونہہ، اور تم نہیں مرے؟'' بوڑھے نے کھسیانے پن سے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

''اف۔'' روپ نے تلملا کر پھر گھڑی دیکھی۔ تین منٹ اور گزر چکے تھے۔

''تم بڑے ڈھیٹ ہو۔'' وہ غصہ و غم سے بھر کر بولا۔

''مجھے پریشان مت کرو۔'' بوڑھا جھنجلا اٹھا۔ ''آخر میں کیوں یہاں سے جاؤں؟''

"شاید تمہاری طرح میرا بھی یہاں سب کچھ لٹ چکا ہے۔" بوڑھے کی آواز میں درد تھا۔

دوپہر کا سایہ قدموں سے آگے کھسکنے لگا۔ روپ کا دل دھڑکتے دھڑکتے منہ کو آنے لگا۔ وہ اب آ رہی ہوگی اور اس بوڑھے نے اسے دیکھ لیا تو وہ پھر کبھی نہ آسکے گی۔ وہ اب آ ہی رہی ہوگی۔ اور اس کا غصہ قابو سے باہر ہوگیا۔ اس کی دنیا نظروں کے سامنے ہی اجڑنے والی تھی۔ جیسے اس نے سب کچھ لٹا کر پایا تھا۔ وہ محض ایک ایسے اتفاق کی خاطر پھر اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والی تھی۔ روپ کا اضطراب ضبط سے باہر ہوگیا۔ اس نے پاگلوں کی طرح چیخ کر بوڑھے آدمی سے کہا۔

"خبیث بوڑھے، چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

بوڑھے اجنبی نے اس کی طرف دیکھا، اس وقت غصے سے روپ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، وہ جو آنے ہی والی تھی۔ بوڑھا اس کے اس پاگل پن سے خوف کھائے بغیر بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور منہ میں کچھ کہتا ہوا بجائے باہر کی طرف جانے کے اٹھا اور کھنڈر کے اندر کی طرف چلا گیا۔ روپ کے غصہ و غم کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور اسی طرف جا رہا تھا، جدھر سے وہ آتی تھی۔

وہ کلکلا کر بوڑھے اجنبی کے پیچھے دوڑا، لیکن میانہ قد کا یدا کہرے بدن والا خاموش اجنبی اس کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر اس وقت تک کھنڈر کے شکستہ دالان کو پار کر کے پچھلے بڑے کمرے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اب روپ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک وزنی پتھر زمین سے اوپر اٹھا لیا اور اسے اوپر تول کر اس بوڑھے اجنبی کی پشت پر پہنچ گیا اور اور پاگلوں کی طرح زور سے گرجا۔

"ٹھہر جاؤ او بوڑھے شیطان۔" اور جیسے ہی وہ چاہتا تھا کہ وہ بڑا سا پتھر اس اجنبی بوڑھے کے سر پر دے مارے، ٹھیک اسی وقت بڑے کمرے کی پچھلی دیوار کے شگاف کی راہ سے اچانک اوشا کی روح اندر داخل ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے روپ، "اوشا" کہہ کر ٹھٹک گیا،

لیکن اوشا نے اس وقت جیسے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں وہ اس بوڑھے کو ایک نظر غور سے دیکھتے ہی چیخ پڑی۔

"پتا جی..." اور پھر وہ بے تحاشا دوڑ کر اس بوڑھے سے لپٹ گئی۔

"ہاں بیٹی، میری رانی بیٹی۔" بوڑھا خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ روپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور پتھر نیچے آ رہا۔ بوڑھے نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا، مگر روپ شاید اسے دوسری روح، غالباً اوشا کے بوڑھے باپ کی روح سمجھا تھا۔ اور وہ ابھی ابھی اسے بوڑھے خبیث اور شیطان اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکا تھا غصے کے عالم میں۔

حیرت وخوف کے ملے جلے کچھ عجیب سے احساسات اس پر اس طرح حاوی ہو گئے کہ وہ وہاں ٹھہر نہ سکا اور بوڑھے کو دوسری روح تصور کرتے ہوئے اپنی بدتمیزیوں کو یاد کر کے اس سے پہلے کہ اوشا کی نظریں اس پر پڑے، کھنڈر سے نکل کر وہاں سے اتنی تیز ٹیلے سے اتر کر بھاگا کہ دور تک اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

قبائلی بستی میں واپس آ کر آج کے محیرالعقل واقع کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دماغ سوج گیا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ بوڑھا آدمی کون ہے۔ اگر وہ اوشا کے باپ کی روح تھی تو نہ جانے وہ اب کیا سلوک کرے دونوں کے ساتھ۔ اور اوشا کو معلوم ہوگا کہ اس کے باپ کی روح کو اتنی مہذب گالیاں دی گئی ہیں تو نہ جانے وہ خوش ہوگی یا ناراض۔ اور سب سے زیادہ اسے یہ فکرستا رہی تھی کہ اب وہ پھر اسے مل بھی سکے گی یا نہیں۔ آج کی ہونی نے تو اسے ایک غیر یقینی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بار بار وہ سوچتا اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ کر کبھی سر کے بال نوچنے لگتا، کبھی دانتوں میں ہونٹ بھینچ لیتا۔ کبھی چہرہ بالکل زرد اور اداس ہو جاتا، کبھی اس پر امید و مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ تمام دن اور پھر لمبی کالی رات بھی گزر گئی۔ بوڑھے قبائلی کے بہت اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہ کھایا، صرف ایک گلاس دودھ پی لیا تھا۔

وہ اس قدر بے چین تھا کہ بات بھی تو ٹھیک سے نہ کرتا تھا۔ بوڑھا اقبال گل غریب حیران ہونے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

صبح اٹھا تو اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ایک مبہم سا خیال،ایک معلق امید، نہ جانے وہ آئے یا نہ آئے ،مگر اس میں آخر روپ کا کیا قصور تھا۔وہ اس بوڑھے اجنبی کی روح کو اس نے تو وہ مقام نہیں بتایا تھا۔وہ اسے بلانے تو نہیں گیا۔وہ اوشا کا باپ تھا۔خود ہی اس کی روح بھٹکتی،ڈھونڈتی وہاں آ پہنچی ہوگی۔

یقیناً وہ اس کے بوڑھے باپ کی روح ہی ہے۔کیونکہ اوشا کی طرح وہ بھی اسی پچھلے کمرے کے شگاف سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔وہ اسی طرف جا رہی تھی۔

اوشا کی خوبصورت سفید اور نرم و نازک روح سے اب اسے کوئی خوف نہ لگتا تھا اس لیے اور بھی کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی ،مگر اس بوڑھے باپ کی روح کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔واقعی وہ آوارہ روحوں کا شہر ہے۔نہ جانے اور بھی کتنی ایسی روحیں وہاں بھٹکتی رہتی ہوں گی۔

بہر حال ان منتشر خیالات کے تسلط کے ساتھ ہی وہ اس امید پر اپنی مایوسیوں کو پیچھے دھکیلے ہوئے تھا کہ شاید جب وہ آج اس کھنڈر میں ملے گی تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اور جب وہ دوپہر سے ذرا پہلے موت کے شہر کی حدود میں داخل ہوا تو آج پھر یہاں کا بھیانک اور پرسکوت ماحول اسے اس خیال سے کسی قدر دہشت زدہ کرنے لگا کہ اور بھی ایسی روحیں یہاں بھٹک رہی ہوں گی، جیسے کل۔اف، وہ بھی جیتے جی کہاں پھنس گیا ہے،مردوں کے شہر میں۔کاش اوشا اسے کہیں اور مل سکتی تو وہ بار بار اس شہرِ آشوب میں نہ بھٹکتا، جہاں کا ذرہ ذرہ موت کی نیند سویا معلوم ہوتا ہے۔جہاں ان گنت مردوں کے ڈھانچے اب بھی کھنڈروں کے ملبوں، درکی ہوئی زمین کی دراڑوں اور پھٹے ہوئے راستوں میں دبے پڑے ہیں۔لیکن وہ نہ آئی۔ ہر گزرنے والی گھڑی کے ساتھ اس کی بیقراریاں بڑھتی گئیں، مگر وہ نہ آئی۔ سورج

مغرب کی طرف ڈھلتا گیا، اس کے دل کی دھڑکنیں بھی بہت تیز اور کبھی بہت مدھم ہوتی گئیں، لیکن اوشا کا پتا نہ تھا۔

"تو کیا وہ پھر بچھڑ گئی مجھ سے؟" وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"نہیں، اب میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔

پھر اچانک اس غمناک مایوسیوں میں اسے خیال آ گیا کہ وہ بوڑھی آتما گنی ضرور اس واقع کے بارے میں بتا سکے گی کہ بوڑھے کی روح کیوں آئی اور اوشا اس سے کیوں بچھڑ گئی۔ وہ ضرور جانتی ہوگی۔ روحیں اس سے ملتی رہتی ہوں گی۔ وہ کھنڈر سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس پہاڑ کی طرف چل دیا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ بار بار پسینہ اس کے چہرے پر پھیل جاتا، جسے رومال سے خشک کرتا ہوا وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا ناہموار راستوں اور ڈھلوان چٹانوں کو عبور کرتا ہوا آخر اس پہاڑ پر پہنچ گیا۔ کلائی کی گھڑی میں اب دو بج رہے تھے۔ جیسے ہی اس بوڑھی آتما گنی کے گپھا کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔

"آ جاؤ۔" آواز بہت صاف اور نرم تھی۔

وہ ٹٹی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

لیکن سامنے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کے قدم رک گئے۔ وہ بوڑھا اجنبی سامنے گپھا میں اس بوڑھی آتما گنی کے سامنے بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے روپ خوف سے لرز سا گیا، مگر وہ بوڑھا آدمی مسکرا کر بولا۔

"آؤ، شیطان بیٹے۔ یہ بوڑھا خبیث تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

اس جملے نے روپ کو اور ڈرا دیا۔ "وہ کیوں انتظار کر رہا ہے؟ کیا وہ اسے ان گالیوں کی سزا دے گا جو وہ غصہ و غم کے جذبات سے بے قابو ہو کر اس کھنڈر میں اسے سنا گیا تھا، لیکن بوڑھے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور دور پھیل گئی۔

اس نے دوبارہ کہا۔ "یہاں آ جاؤ، ڈرو نہیں۔ میں تم سے گالیوں کا بدلہ نہیں لوں گا۔"

Akram Allahabadi

اس کا لہجہ بہت شیریں اور مشفقانہ تھا۔اس کی گفتگو کے اس انداز نے روپ کے سر سے ایک بوجھ سا اتار دیا، اس کا خوف جاتا رہا اور اسے اپنی حماقت پر شرمندگی کے احساس کے ساتھ ساتھ بوڑھے کے لیے اپنے دل میں ایک عقیدت سی محسوس ہونے لگی۔وہ کسی بہت شریف آدمی کی روح معلوم ہوتی تھی۔یقیناً مرنے سے پہلے وہ دوسروں کی گالیاں ہنس کر ٹال دیتا ہوگا۔شریف لوگ ایسی حماقتوں کو کاغذی گولیوں کی مار سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔وہ جھجکتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔تم تو بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔یہاں کوئی اجنبی، کوئی غیر نہیں۔"بوڑھی آتما گنی بہت نرم لہجے میں اس سے بولی اور وہ اس بوڑھے سے کچھ دور پتھریلی زمین پر بیٹھ گیا۔بوڑھی آتما گنی اور وہ بوڑھا اجنبی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

"تم یقیناً ان سے میرے بارے میں پوچھنے آئے ہوگے؟"بوڑھے نے اس کی طرف گھوم کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

"جی، جی ہاں۔" روپ نے رکتے رکتے کہا۔"مجھے معاف کر دیجیے کہ میں نے انجانے پن میں ایسی بیہودگی کی۔"

"میں... میں اس وقت غم و غصے سے پاگل سا ہوا جا رہا تھا۔" روپ سر جھکا کر بولا۔اس کے لہجے میں اظہارِ شرمندگی تھا۔

"ایسی کیا بات تھی؟"بوڑھے نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

روپ اس کا جواب نہ دے سکا اور عجیب سی بے بس نظروں سے بوڑھی آتما گنی کی صورت دیکھنے لگا۔

"انھیں ڈر تھا کہ اوشا ان سے پھر ہمیشہ کے لیے نہ بچھڑ جائے۔"بوڑھی آتما گنی مسکرا کر بولی۔بوڑھا بھی مسکرا دیا۔

"جی۔" روپ نے شرمائے ہوئے انداز میں اقرار کرتے ہوئے پھر سر جھکا لیا۔

Akram Allahabadi

"خیر، مجھے ان سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" وہ بوڑھی عورت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "میں تمہاری محبت کے درمیان رکاوٹ نہ بنوں گا۔ تم اس کا غم نہ کرو۔" بوڑھے نے بزرگانہ، لیکن محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ...؟" روپ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، مگر بوڑھا اجنبی پھر بول اٹھا۔

"میں اوشا کا باپ ہوں اور یہ... یہ اس کی ماں ہیں۔ ہماری ایک ہی بچی رہ گئی ہے۔" وہ کہنے لگا۔ روپ اس جملے پر بے طرح چونک کر ان کی صورتیں تکنے لگا۔ وہ آخر کہہ کیا رہے ہیں۔ باپ... ماں... بچی...

"تو کیا آپ...؟" اس نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھ کر بھی وہی حیرت کا جملہ کہنا چاہا، مگر اس نے بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ میں اوشا کی ماں ہوں۔ میں آتما گنی نہیں، لیکن کیونکہ تم ایک شدید اور مسلسل وہم کے شکار تھے، اس لیے تمہارے یقین و خیال کی تسکین کے لیے مجھے تمہارے لیے آتما گنی ہی بننا پڑا، ورنہ شاید تم مجھے اپنی داستان بھی نہ سناتے، نہ مجھ سے مدد مانگتے۔ کیوں ہے نا؟" وہ کہتے کہتے اس سے سوال کر بیٹھی۔

"تو گویا آپ لوگ بھی روح ہیں؟"

"نہیں، ہم سب زندہ ہیں۔ دراصل تمہارے احساسات عرصے سے ایک آسیبی یقین سے متاثر رہے ہیں، اس لیے تم اس جگہ کے ہر اجنبی وجود کو روح سمجھ رہے ہو۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"اور اوشا...؟" روپ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"وہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ میں اور وہ اس خوفناک زلزلے کے وقت اس جگہ موجود نہ تھے، اس لیے اتفاق سے بچ گئے، مگر میرا ایک لڑکا اور اوشا کی بہن اوما اور میرے دو نوکر وہ سب اسی بنگلے میں دب کر مر گئے۔" بوڑھی عورت نے اسے تفصیل بتائی۔

Akram Allahabadi

''تو وہ... وہ اوشا کی روح نہیں ہے؟'' روپ کا دماغ بری طرح الجھنے لگا جیسا سے ان باتوں پر مطلق یقین نہیں آ رہا تھا۔

''نہیں، اوشا زندہ ہے۔ اوما اور اوشا دونوں جڑواں بہنیں تھیں اور دونوں کی صورت بالکل ایک جیسی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اوما کے کان ذرا چھوٹے تھے۔''

''اوہ۔'' روپ کے جذبات میں ایک عجیب سا انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ''تو وہ اس لڑکی کی روح نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تم بری طرح روحوں کے تصور سے متاثر نظر آتے ہو۔ اوشا نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اسے اوما کی روح سمجھ رہے ہو، کیونکہ اتفاق سے جب وہ اپنے مرے ہوئے بھائی بہن کو یاد کرتی اپنے پرانے گھر کے کھنڈر میں پہنچ گئی تھی، اسی دن تم لوگوں نے اوما کی لاش کو کھنڈر سے نکال کر کسی ٹیلے پر چتا میں جلایا تھا۔ اس وقت اوشا بھی آخری بار اپنی مردہ بہن کی صورت دیکھنے گئی تھی اور چتا کے پاس ہی تم نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پھر جب وہ ان کے بچھڑ جانے کے غم سے متاثر ہو کر پھر اسی کھنڈر میں جو کبھی ہمارا گھر تھا آنسو بہانے آ بیٹھی تو تم پھر وہاں بھی آ پہنچے اور اسے بھاگنا پڑا۔'' بوڑھی عورت کہتے کہتے رک گئی۔ بوڑھا اجنبی روپ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن اوشا نے تو کہا تھا کہ وہ...''

''روح ہے۔'' بوڑھیا مسکرائی۔ ''مگر اس لیے کہ تم اسے اوما کی روح ہی سمجھ رہے تھے۔ وہم کا علاج وہم سے کیا جاتا ہے۔ میرے ہی مشورے پر اسے اوما کی روح بن کر تم سے ملنا پڑا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر بولنے لگی۔

''تم اسے اوما کی روح سمجھ کر اس سے محبت جو کرنے لگے تھے اور پھر وہ کہتی تھی کہ تمہاری باتیں، تمہاری شرافت اور تم خود اتنے اچھے ہو کہ وہ... بس یوں سمجھو کہ وہ بھی تم سے محبت کرنے لگی۔'' بوڑھی نے آخر کہہ ہی دیا۔

Akram Allahabadi

''تو انھیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟'' روپ نے سوال کیا۔

''کوئی بھی اکیلی اجنبی لڑکی ایسے ویران ماحول میں اچانک کسی اجنبی لڑکے پر اعتبار نہیں کرسکتی۔ نہ جانے وہ کیسا ہو۔ اور اس وقت تم سے دور رہ کر تمہیں پرکھنے کا یہی صحیح طریقہ تھا۔ ممکن ہے تمہاری جگہ وہاں کوئی اور ہوتا تو ایک نوجوان لڑکی کی عزت کو ایسی جگہ جہاں کوئی مدد کو بھی نہ آسکے خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔'' بوڑھی عورت نے صاف گائی سے کام لیا۔

''اور... آپ یہاں اس ویران پہاڑ پر کیوں رہ رہی تھیں؟''

روپ نے پھر ایک سوال کردیا۔ حالانکہ اس کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت عجیب سے موڈ میں تھا، جیسے کوئی سراغرساں بال کی کھال نکال رہا ہو۔

''یہ ایک الگ داستان ہے۔'' بوڑھی عورت نے سرد سانس کھینچی اور بوڑھے اجنبی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''اس کا ذمے دار میں ہوں۔'' بوڑھا آدمی بول اٹھا۔

''پانچ برس پہلے میں ایک دن ان سے لڑ کر گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں رنگون میں رہا، لیکن میں وہاں کچھ ایسی زندگی میں پڑ چکا تھا کہ میں نے ان لوگوں کی خبر تک نہ لی۔ نہ ان لوگوں کو پھر میرے بارے میں کوئی خبر مل سکی۔ مگر جب میں نے اخباروں میں آسام میں آنے والے زلزلے کی خبر کو عرصے بعد لوگوں کے منہ سے سنا، کیونکہ میں اخبار بہت کم پڑھتا ہوں، تو میرا دل گھبرانے لگا کہ کہیں میرے بیوی بچے بھی اس زلزلے میں شکار نہ ہوگئے ہوں۔ اس وقت وہ پرانی ناراضگی بھی بھول کر میں بیقرار ہو کر ہندوستان آ پہنچا اور کلکتے سے ہوتا ہوا کل ہی یہاں پہنچا تھا۔ بنگلے کے کھنڈر پر بیٹھا ہوا میں اسی لیے رو رہا تھا کہ میرے خیال میں یہ سب زلزلے میں دب کر مر چکے تھے، مگر جب میں نے اچانک اوشا کو دیکھا تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ پھر وہی مجھے یہاں لے کر آئی۔''

''انھیں۔'' بوڑھا پھر اپنی بوڑھی پتنی کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''یقین تھا کہ میں

ابھی تک زندہ ہوں۔اس لیے یہ آسام کے مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ یہاں سے بھاگنے کی بجائے اس ویران مقام پر جو کافی محفوظ ہے میری واپسی کا انتظار کررہی تھیں۔ یہ کہتی ہیں کہ انھیں میرے واپس آجانے کا پورا یقین تھا۔اور سچ مچ میں لوٹ آیا۔اوشا زیادہ تر ان کھنڈرو میں میری واپسی کی امید کے ساتھ ہی جاتی تھی۔"بوڑھا یہ کہہ کر رک گیا اور روپ کی شکل دیکھنے لگا۔روپ گہری سنجیدگی سے یہ باتیں سن رہا تھا،لیکن بوڑھے کا آخری جملہ جیسا سے کچھ تکلیف پہنچا گیا۔

"اوشا زیادہ تر ان کھنڈروں میں اپنے باپ کی واپسی کی امید کے ساتھ ہی جاتی تھی۔"

تو کیا اوشا کو مجھ سے محبت نہ تھی؟ کیا وہ وہاں میرا انتظار نہیں کرتی تھی؟ سوچتے سوچتے اس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔محبت کے لطیف احساسات بھی بعض وقت کتنی نازک،مشکل اختیار کرلیتے ہیں۔

وہ اس عجیب اور مسرت خیز انکشاف پر بجائے خوشی سے جھوم اٹھنے کے اداس معلوم ہورہا تھا،جیسے اسے یہ جان کر خوشی نہ ہوئی ہو اور بوڑھا گہری سنجیدہ نظروں سے اس کی کیفیت کا مطالعہ کررہا تھا۔اور روپ اپنے خیالات کی گہرائیوں میں کھویا ہوا تھا۔اس کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا۔وہ دنیا کی نظروں میں پاگل اور وہمی بن کر مدت تک ایک ایسی لڑکی کے پیچھے بھٹکتا رہا جو غیر معمولی اور اتنی بلند نہ تھی جس قدر ایک پاکیزہ روح،ایک لاہوتی حسن ہوسکتا ہے۔خوبصورت لڑکیاں تو ہر جگہ اور بہت سی مل سکتی ہیں۔ پہلے سب سے پہلے اس نے اوما کے مردہ جسم کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس کے ساتھ آرزو کی تھی کہ کاش یہ زندہ ہوتی،لیکن بعد میں اوما کی ہم شکل اوشا کو اوما کی روح سمجھ کر اپنے روم روم میں بسائے ہوئے وہ اس مادی دنیا کی آرزو کو بھول چکا تھا جس میں اجناسِ کشش کے ساتھ جنسی کشش بھی ہوتی ہے۔جس میں خوبصورتی کو اپنے اندر سمو لینے والے معیار سے محبت کی جاتی ہے۔وہ دنیا سے پرے، ماحول سے اوپر،فکرو

یقین سے بلند ہو کر اس آفاقی تخیل میں کھو گیا تھا جہاں لامحدود، لامتناہی وسعتوں تک صرف ایک پاکیزہ، غیر فانی، خوبصورت اور غیر جذباتی روح کے ساتھ اس کی زندگی اور مابعد حیات کے سلسلے دوڑتے ہیں۔ جہاں اس گندگی کا شائبہ بھی نہ ہو جو محبت کی آڑ میں جنسی خرید فروخت، تنسیخ و تبادلے، وفائیں اور بے وفائیاں، ملاپ اور علیحدگی، بیزارگی اور بیزاری پھیلاتی ہے۔ وہ زندگی کی عام نفسیاتی قیود سے دور ہو کر ایک مافوق الفطرت خواب دیکھ رہا تھا، جسے اس نے اپنی تکمیلِ محبت کی منزل سمجھ رکھا تھا۔ لیکن آج، آج تو سب کچھ الٹا ہوا۔ اوشا عالمِ لاہوت کی ایک خوبصورت سفید لہراتی ہوئی پاکیزہ روح نہ تھی، صرف ایک عورت تھی، جیتی جاگتی، ایک معمولی عورت جو بہت خوبصورت تھی تو کیا ہوا، جوان تھی تو کون سی خصوصیت تھی؟

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" بوڑھے اجنبی سے نہ رہا گیا تو وہ بول اٹھا۔

"جی..." روپ چونک پڑا۔ "کچھ نہیں... کچھ تو نہیں۔" وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کیوں، کیا اوشا سے نہ ملو گے؟" بوڑھی عورت نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا دماغ اس وقت بہت پریشان ہے۔ میں... میں جانا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر چلنے لگا۔ بوڑھا آدمی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی بوڑھی بیوی نے اسے آنکھ سے اشارہ کر دیا اور وہ چپ رہ گیا۔ روپ نے ایک عجیب سی دردناک اور جھینپی ہوئی نظر سے ایک بار پلٹ کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج یہ چیز اس کی پچھلی حماقتوں کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"عجیب پاگل لڑکا ہے۔" بوڑھا بولا۔

"اتنے دنوں کا وہم اچانک تو پیچھا نہ چھوڑ دے گا۔ وہ خود ہی سب ٹھیک کریں گے، تم مت بولو۔" بوڑھی نے اسے منع کر دیا۔ وہ پوچھنے لگا۔

"پھر اب رنگون کب چلنا ہے؟"

"ان کا جھگڑا سلجھ جانے دو۔" بوڑھی نے مختصر سا جواب دیا۔ اور پھر دونوں سوچ

میں پڑ گیے۔

☆☆☆☆☆☆

روپ کی کیفیت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔وہ بری طرح غیر مطمئن اور پژ مردہ نظر آرہا تھا، جیسا سے یہ جان کر اور صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ایک زندہ وجود کو... نہ جانے کیوں۔وہ بے ترتیب قدم رکھتا ہوا ڈھلوان کی طرف سے پہاڑ سے اتر رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے اوشا آپہنچی۔

''روپ۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر چیخی۔روپ نے ایک بار پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، چند لمحوں تک وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا اور بغیر جواب دیے منہ پھیر کر آگے بڑھنے لگا۔

''ٹھہر جاؤ، روپ۔'' اوشا کی آواز میں اب کی بار ایک لرزتی ہوئی التجا تھی۔روپ کے قدم آہستہ ہو گئے۔وہ اس کے قریب آ گئی۔

''کیا روٹھ گئے ہو مجھ سے۔'' اس نے معصوم نظروں سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''ہونہہ، یہ تو تمہارا ہے حصہ ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اوشا نے پوچھا۔

''اپنی اس دنیا کی تلاش میں جواب بے سکونی کے گہرے خلاء میں کھو گئی ہے۔اس یقین کو ڈھونڈنے جواب سے کچھ دیر پہلے حاصل تھا۔اس محبت کو تلاش کرنے جس پر میں نے زندگی کے بیش قیمت لمحات ضائع کیے ہیں۔'' وہ ٹھہر کر کھڑے ہوئے انداز میں بولا۔

''مگر میں تو تمہارے سامنے ہوں۔'' اوشا نے انتہائی رومانوی لہجے میں کہا۔اس کی آواز میں ایک دلفریب لچک تھی جیسے کہہ رہی ہو، میرے محبوب تمہاری منزل تو تمہارے قدموں

Akram Allahabadi

میں ہے۔

"تم ...تم صرف ایک عورت ہو، ایک معمولی عورت اور کچھ نہیں۔" روپ نے روکھا سا جواب دیا۔

"کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟" اوشا نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"تھی، مگر اس پاکیزہ روح سے جو عورت نہیں تھی۔ اس آسمانی وجود سے جو اس دنیا کی غلاظتوں سے پاک ہے۔ جس کی قیمت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ جس کی محبت بھی اس کی طرح غیر فانی ہے۔ میرے دل و دماغ جو تخیل ہے بس چکا ہے، اوشا، وہ تمہارے اس خاکی وجود سے بہت اونچا ہے۔ تم صرف عورت ہو۔ ایک معمولی لڑکی۔" اس نے دہرایا۔

اور اوشا گم سم کھڑی اس کی یہ عجیب منطق سنتی رہی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"ایک بار تم نے کہا تھا کہ اگر زندہ ہوتی تو تم ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔" اوشا نے کانپتی ہوئی آواز میں اسے اس کی کہی ہوئی بات یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ لیکن تم جانتی تھیں کہ مجھے عورت سے نفرت ہے، میں اس کی وفاؤں پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دھوپ اور چھاؤں کی طرح اپنے آپ کو بدل لیتی ہے۔" روپ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم جو کبھی میری ذرا سی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتے، آج میرا دل ٹوٹتے درد محسوس نہیں کر رہے ہو؟" اوشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم وہی ہوتیں اوشا، جو میں نے تمہیں سمجھا تھا، تو میں تمہارے لیے اپنی زندگی کی ایک ایک سانس قربان کر دینے سے دریغ نہ کرتا۔ تم نے مجھے سمجھا نہیں، اوشا، تم نے مجھے بالکل نہیں سمجھا۔" وہ پریشان بالوں کو ایک طرف جھٹک کر بولا۔

"تو تمہیں اب میری ضرورت نہیں؟" اوشا کی آواز اس کے روندھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔ وہ بری طرح نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

Akram Allahabadi

"مجھے میرے غموں کے ساتھ زندہ رہنے دو، اوشا۔ ایشور کے لیے میرے احساسات کو اور نہ جھنجوڑو۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ عورت کی یہی فطرت ہے۔ تم جاؤ میری اجڑی ہوئی زندگی میں اب اور کانٹے نہ بکھیرو۔ تم جاؤ۔ تمہاری دنیا تمہیں مبارک ہو۔ تم نے مجھے پاگلوں کی طرح مہینوں اپنے اشاروں پر نچایا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ عالمِ بالا سے ایک پاکیزہ روح صورمیری محبت کی خاطر اس دنیا تک مجھ سے ملنے ان کھنڈروں میں آتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ خوبصورت فریب میری زندگی سے کھیل رہا ہے۔ ایک لڑکی وہاں صرف اپنے باپ کو ڈھونڈنے آتی تھیں، اور میں؟ میں پاگلوں کی طرح اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ دل ٹوٹ گیا، اوشا۔ اب تم چلی جاؤ۔" وہ جھنجلا کر بڑبڑاتا ہوا تیزی سے ڈھلوان اترنے لگا۔

"روپ..." اوشا چیخی۔ "مجھے اس طرح برباد کر کے نہ جاؤ۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ عورت کسی سے محبت نہیں کرتی۔ وہ صرف اپنے آپ سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔" روپ چیخ کر اس کی بات کا جواب دیتا ہوا پہاڑ سے اترتا چلا گیا۔

"سنو، روپ۔ نہ جاؤ، ایشور کے لیے لوٹ آؤ۔" اوشا بھی اس وقت جذبات سے بے قابو ہو کر اس کے پیچھے دوڑنے لگی۔ مگر روپ کافی آگے جا چکا تھا، وہ اور تیز ہو گیا۔

"روپ..." ایک بار اور وہ چلائی۔ لیکن اب وہ ڈھلوان میں گم ہو چکا تھا۔ "تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمہیں بچھڑنے نہ دوں گی۔" وہ ایک چٹان کے سرے پر رک کر بڑبڑائی۔ اس کا چہرہ اس وقت کسی عجیب سے خیال سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو۔" اس نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ میری محبت شرمندہ نہ ہوگی۔ میری وفائیں مدھم نہ ہوسکیں گی۔"

Akram Allahabadi

یہ کہہ کر وہ اس چٹان پر سے نیچے کود پڑی۔

نیچے دور پہاڑی کے دامن میں چند ہلکی سی کراہٹیں سنائی دیں اور پھر موت کے شہر کا خوفناک سناٹا ابھر آیا۔

☆☆☆☆☆☆

کھنڈر کے نزدیک پہنچ کر وہ اس میں داخل ہو گیا۔اس وقت اس کا دل بری طرح دکھا ہوا تھا۔وہ یہاں بیٹھ کر گزرے ہوئے دنوں کو آواز دینا چاہتا تھا۔ان رومانی حسین لمحات کے تصور کو دہرانا چاہتا تھا جو اس نے یہاں ایک روح کے ساتھ گزارے تھے۔کتنی مختلف تھی اوشا۔ایک روح کی حیثیت سے اور کتنی معمولی ثابت ہوئی وہ ایک زندہ عورت بن کر۔نہ جانے کیوں اسے موت و زندگی میں اتنا عظیم فرق معلوم ہو رہا تھا جو فکر و یقین کر مابعدالطبیعاتی حالات کو ترجیح دینے پر آمادہ کر دے۔اور اس وقت اس کے شعور تحتی میں چھپی ہوئی وہ کرید جو اس کی زندگی کا خاص جز و تھی،اور جس سے وہ خود بے خبر تھا،پوری طرح عیاں ہو گئی کہ وہ ہر شے میں ایک ندرت،ایک خصوصیت،بلکہ غیر فطری پن کو پسند کرتا ہے۔اسے عام چیزوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں۔وہ انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ وہ موجودات سے انوکھے نہیں۔ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جسے نظر نے بار بار نہ دیکھا ہو یہی اس کی زندگی کا راز تھا۔معمولی لڑکیاں،معمولی رومان،معمولی افسانے،ایک گھس پٹا معمولی اور اس کی معمولی زندگی۔یہ سب تو اکتا دینے والی دنیا تھی جس سے وہ دور بھاگتا تھا۔پھر وہ اوشا بھی ان میں سے ایک ثابت ہوئی جسے وہ کائنات کی بلندیوں سے اوپر،افق کی نیلی گہرائیوں مس ایک مافوق الفطرت وجود،ایک انتہائی رومان آفریں اور خوبصورت روح کی شکل میں دیکھتا رہا تھا۔احساس خود ایک مستقل بیماری ہے۔مگر کیا وہ ایسی بالکل بھول سکتا تھا۔اس کا دل خود اس سے پوچھ رہا تھا۔بہت دیر تک کھنڈر میں بیٹھا بیٹھا وہ اس کا شگاف گھورتا رہا،جدھر سے وہ غائب ہو جایا کرتی تھی۔

Akram Allahabadi

''ہونہہ...ایسا خوبصورت فریب۔'' وہ بڑبڑایا۔

لیکن ٹھیک اسی وقت ہواؤں میں ایک عجیب موسیقیت اور سناٹے میں ایک عجیب سی بھیانک گونج پیدا ہوئی جسے وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر آج وہ پوری طرح اپنے حواس و یقین میں بیدار تھا۔ کوئی آسیبیت اس پر اپنا تسلط نہ جما سکتی تھی۔ اور اس کی نظر اس شگاف پر جمی رہ گئی جب اس نے دیکھا کہ ایک ہوا کی طرح اوشا اس میں سے داخل ہو رہی ہے۔ اس کی آمد کا یہ انداز بالکل نرالا، جیسے سارا کھنڈر ایک مدھم سی گونج سے لرزنے لگا ہو۔ روپ نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

اوشا بہت سنجیدہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔

''اب یہاں کیوں آئی ہو؟ کیا کوئی نیا فریب سوجھا ہے؟'' وہ منہ پھیرے ہوئے ہی اس سے بولا، لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اوشا۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم نے جس پر میں اپنی زندگی لٹا دینے کے لیے آمادہ تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اوشا کچھ معذرت کرے گی، کچھ معافی مانگے گی، مگر وہ کچھ نہ بولی۔ اس کھنڈر کی پرانی رومانیت جاگ اٹھی۔ آج وہ پھر اس کے قریب ہی تو کھڑی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اوشا رو رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ دور گم سم کھڑی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک رہے تھے۔ اس وقت روپ کی اندرونی کیفیت پہلے کی بہ نسبت کچھ اعتدال پر آچکی تھی۔ اور شاید وہ اوپری دل سے زیادہ بڑبڑا رہا تھا۔ شاید وہ تیار ہو چکا ہوگا کہ اگر اس سے پہلے والا والہانہ عشق نہ کرے تو کم از کم اسے معاف ضرور کرے۔ مگر اوشا کو آخر منانا بھی تو چاہیے تھا۔ وہ بھی تو محبوب تھا اس کا۔ کیا ہوا جو جھک کر پیر تھام لیتی۔ نہ سہی، مگر روتی ہوئی اس کی آغوش میں ہی گر پڑتی۔ عجیب عجیب معصوم اور خاموش آرزوئیں جنم لینے لگیں اس کے دل میں اسے دیکھ کر۔ طوفان مسلسل تو نہیں رہتا، وہ بناہی پڑتا ہے۔

Akram Allahabadi

اور جب اس نے دیکھا کہ وہ بول ہی نہیں رہی تو وہ خود اپنا لہجہ بدلتے ہوئے اس کی طرف گھوما۔

"اوشا تم نے آخر ایسا کیوں کیا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" اب کی بار اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ لیکن اوشا تو شاید بولنے کو تیار ہی نہ تھی۔ وہ گم سم کھڑی اور سفید چمکیلے آنسو اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔ جذباتی روپ ان آنسوؤں کے پیہم بارش سے پگھل گیا۔ اس کے چہرے سے سرخی ختم ہوگئی اور سنجیدگی عود کر آئی۔

"نہ بولوگی؟ خیر، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب پونچھ ڈالو یہ آنسو۔" یہ کہہ کر جیسے ہی اس نے اوشا کی آنکھوں کے آنسو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس کی انگلی خلا میں بھٹکنے لگی۔ وہ ایک دم سر سے پیر تک لرز گیا۔ اف بھگوان، وہ تو وہیں کھڑی تھی، لیکن انگلی نہ جانے کہاں بہک رہی تھی۔ کیا وہ ٹھوس نہ تھی۔ محض ایک عکس۔ اور اس نے اس وقت سنبھل کر غور سے اسے دیکھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس وقت تو وہ بالکل مختلف تھی۔ زندہ لوگوں سے بالکل مختلف۔ اس کا جسم جیسے بے قلعی کے شیشے کا بنا ہوا، اس میں سے نگاہیں گزر کر پچھلے بڑے کمرے کی دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔ روپ نے گھبرا کر آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا۔ وہ اسی طرح خاموش کھڑی تھی۔ ایک بار لرز کر روپ کی چیخ نکل گئی۔

"اوشا۔ تم... یہ کیا ہوا... یہ کیا ہے...؟" وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس کے گلے کی رگیں تن گئیں اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ اوشا کی روح اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگی۔

"ٹھہرو، اوشا... ٹھہرو، اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم چلی جاؤ گی؟" وہ وحشیانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

وہ شگاف کی راہ سے کھنڈر سے نکل پڑی۔ روپ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مسمریزم کے اثر زدہ آدمی کی طرح ٹھٹھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف تیز تیز دوڑنے لگا

Akram Allahabadi

اور وہ ہوا پر لہراتی آگے بہتی چلی گئی۔

"اوشا، ٹھہرو اوشا، میری بات کا جواب دے دو، ٹھہرو، اوشا..." مگر وہ تو ہوا تھی۔ وہ ہوا میں سفید دھوئیں کے نقش ونگار کی طرح لہرا رہی تھی۔

اسی طرح اس کے پیچھے دوڑتا دوڑتا وہ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گیا۔ یہاں سے پہاڑ ایک دم سیدھا اونچائی کی طرف اٹھتا چلا گیا تھا۔ ایک گہرا گڑھا تھا اس کے پاس ایک چٹان اور پھر پہاڑ کی دیوار، لیکن وہ اس وقت اپنے ہوش ہی میں نہ تھا۔ وہ اس ہوا کو تھامنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اوشا کی روح سامنے تھم گئی۔ وہ حیران رہ گیا کہ ابھی تک دور بھاگتے بھاگتے وہ کیوں رک گئی، مگر آپ سے آپ جب روپ کی نظریں اس پر سے ہوتی ہوئی نیچے ٹکرا جانے والی چیز پر پڑیں تو اس کا دماغ سن ہو گیا۔ رگوں میں خون کا دوران جیسے اچانک رک گیا ہو اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اوشا کا مردہ جسم تھا جو خون میں لہو لہان چٹان پر دھوپ میں پڑا تھا۔ خون کے تھکے چٹان پر ادھر ادھر پھیل کر خشک ہو گئے تھے۔ روپ نے حیرت و غم سے پھٹی جانے والی آنکھوں سے ایک بار اوشا کے مردہ جسم اور ایک بار سامنے ہوا میں لہراتی ہوئی اس کی روح کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور وہ پھٹے ہوئے گلے کے ساتھ زور سے چیخ اٹھا۔

"یہ کیا ہوا۔ تم نے اوشا، یہ کیا کیا۔ یہ کیا ہو گیا بھگوان۔ وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ اور سامنے لہراتی ہوئی اوشا کی روح کے ہاتھ پھیلے کے پھیلے رہ گئے۔ وہ نہ اسے چھو سکتی تھی، نہ کچھ بول سکتی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلتے ضرور دکھائی دیے، لیکن کوئی آواز نہ تھی۔ اسے سارے جسم کا خون سمٹ کر دماغ کی طرف دوڑتا محسوس ہوا۔

"ارے یہ کیا کر ڈالا تم نے میری زندگی۔" روپ کی آواز بری طرح بھرا رہی تھی۔ درد سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی جذباتیت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے آگے شاید کچھ نہ ہو۔

Akram Allahabadi

مگر، میں اب بھی تم سے پوچھ رہا ہوں اس کا سبب تو میں ہوں۔تمہارا گنہگار میں ہوں، اوشا۔اپنے پاگل پن میں میں نے تمہارا دل توڑا تھا۔میں تمہیں چھوڑ کر بھاگا تھا۔اوشا، میں وہ بدنصیب ہوں جس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔"

"میں نے ہی تم سے کہا تھا کہ تم ایک معمولی عورت ہو۔مجھے تو اوشا کی روح سے محبت تھی اور واقعی تم میرے لیے روح بن گئیں۔تم نے اس کمینے بدنصیب روپ کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔"

"ہے اوشا، بھگوان، ایک بار اور پھاڑ دو اس دھرتی کا سینہ تا کہ وہ مجھے اپنے اندر لے کر چبا جائے۔میری ہڈیاں تک پیس دے۔اف، اب کیا ہوگا، بھگوان۔" اور چیختے چیختے اس کی نظر پھر اوشا کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش پر جا پڑی۔سہ پہر کی دھوپ میں اس کا معصوم چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا جس پر دوسری طرف خون کی چادر پھیل کر سوکھنے لگی تھی۔

"میری ملکہ، میری رانی، میری زندگی۔" روپ نے خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو اٹھا کر سینے سے دبوچ لیا۔ٹھنسے ہوئے آنسو پھوٹ نکلے۔وہ اسے اتنی طاقت سے سینے سے چمٹائے ہوئے تھا کہ جیسے کوئی اسے اس سے چھینے لے رہا ہو۔

اور اوشا کی روح سامنے کھڑی اسے درد میں ڈوبی ہوئی معصوم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔بار بار اس کے ہاتھ آگے بڑھ کر سمٹ جاتے۔روپ سے نہ رہا گیا۔اس کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا ہو۔اس نے بری طرح منہ بسور کر پھر سینے سے چمٹی ہوئی اوشا کی لاش کو دیکھا۔اس کی معصوم صورت اور بند آنکھیں جھکی ہوئی گھنیری پلکوں کو چومتے ہوئے اس کی دیوانگی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔

"نہیں۔میں غدار نہیں ہوں۔دنیا جانتی ہے، بھگوان جانتا ہے کہ میں نے زندگی میں صرف تم سے محبت کی ہے۔وہ محبت جس میں سپردگی تھی۔آج جب میرے لیے تم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا، میں پیچھے نہ رہوں گا، اوشا۔" وہ کچکچا کر اسے پھر سینے سے لگاتے ہوئے

بڑبڑایا۔

"میری معصوم روح، تم اکیلی نہ رہ سکو گی وہاں۔ میں تمہیں اکیلی نہ رہنے دوں گا۔"

اور پھر صبر نہ ہو سکا تو وہ اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی کیفیت غیر ہوتی گئی۔ "بھگوان، اس چاندی صورت کو میں اب کہاں پاؤں گا۔ میں نے خود اسے کھویا ہے۔ میں نے... مگر..."

اس نے زور سے اپنا سر پتھریلی چٹان پر دے مارا۔ خون کی چادر ماتھے سے پھوٹ کر چہرے پر پھیل آئی۔ خون دیکھتے ہی اس کی کیفیت اور تبدیل ہو گئی۔ لو یہ تحفہ، تمہاری روح کے لیے یہ تحفہ لا رہا ہوں، اوشا، میری رانی۔" یہ کہہ کر اس نے اوپر سے بہہ کر آنے والے خون میں بھیگے ہوئے اپنے ہونٹ اوشا کے مردہ ہونٹوں پر رکھ دیے اور انھیں خون سے رگڑنے لگا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر چہرے پر پھیلتا رہا اور وہ اوشا کے مردہ چہرے پر اپنا چہرہ ملتا رہا۔ اوشا کی روح بے قرار، مضطرب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیخ بھی اٹھتی تھی، لیکن کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اوشا کے منہ پر خون آلود منہ ملتے ہوئے اس نے پھر ایک بار زور سے اپنا سر زمین پر دے مارا اور پھر سر پٹکتا ہی گیا، یہاں تک کہ اس کا سر جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔ چاروں طرف خون ہی خون پھیل گیا۔ اور وہ آنکھیں بند کرتے کرتے ایک بار پوری طاقت سے اوشا کے مردہ جسم کو سینے سے دبوچ کر اسی جگہ گر پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

کچھ دیر بعد سفید دھوئیں سے بنائے گئے نقش و نگار کی طرح دو متحرک سائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے موت کے شہر کے اس ویران کھنڈر کی طرف ہوا میں قدم جاری رکھتے ہوئے جا رہے تھے، جہاں دو زندگیوں کی ایک عجیب و غریب رومانی داستان نے

Akram Allahabadi

ایک دن جنم لیا تھا اور آج انجام کو پہنچ چکی تھی، البتہ ایک ممتا کی ماری ماں اور ایک آخری اولاد بھی کھو دینے والا بدنصیب باپ، ''اوشا... اوشا...''، چیختے ہوئے اس ویران ''موت کے شہر'' میں بھٹکتے پھر رہے تھے، جس کی آسیبیت میں دو روحوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا، لیکن ان کی موت مختلف تھی۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi